مسلم سماج

ذمہ داریاں اور تقاضے

مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی

جمع و ترتیب

محمود حسن حسنی ندوی

محمد وثیق ندوی

ناشر

دار الرشید

لکھنؤ - الہند

جملہ حقوق محفوظ

باردوم

۱۴۳۸ھ ـــــــــ ۲۰۱۷ء

نام کتاب:........................ مسلم سماج- ذمہ داریاں اور تقاضے

صفحات:.. ۲۰۰

تعداد اشاعت:.................................... گیارہ سو (۱۱۰۰)

طباعت:.................................... کاکوری آفسٹ پریس، لکھنؤ

قیمت:...................................... ۱۴۰ روپئے

دار الرشید

لکھنؤ- الھند

فہرست عناوین

باب اول
ثقافت وتعلیم

نمبر شمار	عناوین	صفحہ نمبر
۱	پیش لفظ	۵
۲	اسلامی ثقافت	۱۰
۳	دینی تعلیم کی اہمیت وضرورت	۲۵
۴	دینی مدارس، اہمیت، افادیت اور ضرورت	۳۱
۵	جدید نظام تعلیم میں اصلاح کی ضرورت	۳۷
۶	مسلمانوں کی تعلیم میں ترقی کی ضرورت اور قابل توجہ پہلو	۴۵
۷	مسلمانوں کی نئی نسل کی تربیت کی ضرورت	۵۳
۸	اولاد کی تعلیم وتربیت	۶۰
۹	دینی وتعلیمی کام کی اہمیت اور ضرورت	۶۷

باب دوم: اصلاح معاشرہ

۱	اصلاح معاشرہ کیوں اور کیسے؟	۷۴
۲	ہمارے معاشرہ کے قابل اصلاح پہلو	۷۹
۳	عمل صالح اور حسن تدبیر	۸۶
۴	عزم وہمت اور عمل پیہم	۹۳

۵	خودرائی، غیبت اور جھوٹ معاشرے کے تباہ کن روگ	۹۷
۶	معاشرہ میں اسلامی نظام اقتصادیات کی تطبیق کی ضرورت	۱۰۲
۷	مالی اداروں کو سود سے پاک کرنے کی ضرورت	۱۰۷

باب سوم: دعوت حق

۱	دعوت واصلاح کے عمل کی ضرورت	۱۱۵
۲	اسلامی کاز کے دو وسیع میدان، تبلیغ اسلام اور اصلاح معاشرہ	۱۱۹
۳	اسلامی بیداری کے لئے علمی اور نشریاتی جدوجہد کی ضرورت	۱۲۶
۴	اسلام اور مسلمانوں کا دفاع - علماء وقائدین کی اہم ذمہ داری	۱۳۲
۵	دعوتی کام امت مسلمہ کے تحفظ وبقا کا ضامن	۱۳۸
۶	ہمارا کردار غیر مسلموں میں	۱۴۳

باب چہارم: اتحاد اور اجتماعیت

۱	مسلمانوں کی ملی تعمیر کا مسئلہ	۱۴۹
۲	وحدت اور مقصدیت ملت کی ناگزیر ضرورت	۱۶۰
۳	تعاون اور رواداری اجتماعی کامیابی کا راستہ	۱۶۴
۴	دو وحدتیں: وحدت خداوندی اور وحدت انسانی	۱۶۸

باب پنجم: محاسبۂ نفس

۱	احساس ذمہ داری اور محاسبہ وتجزیہ کی ضرورت	۱۷۴
۲	ذاتی خرابیاں کامیابیوں کی راہ کا پتھر	۱۷۸
۳	ذاتی مفاد پر ملی مفاد کو ترجیح اور احتساب نفس کی ضرورت	۱۸۳
۴	فرض شناسی، ہمدردی اور دیانت داری تین کلیدی صفات	۱۸۸
۵	اکرام مسلم اور احترام انسانیت	۱۹۵

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

الحمد للہ رب العالمین، و الصلاۃ و السلام علی سید المرسلین و خاتم النبیین محمد بن عبد اللہ الأمین ، و علی آلہ و صحبہ أجمعین، أما بعد ۔

اسلام میں مذہبی زندگی کو صرف عبادت کے دائرہ ہی میں محدود نہیں رکھا گیا ہے، بلکہ انسانی زندگی کے دیگر تمام پہلوؤں کو بھی مذہبی سرپرستی عطاء کی گئی ہے، اور یہ سرپرستی اور رہنمائی انسانوں کے خالق و مالک رب العالمین کی طرف سے کامیابی کا ذریعہ قرار دی گئی ہے، دنیا کے دیگر مذاہب میں بھی جو مذہبی ہدایات دی جاتی ہیں ان کو عام طور پر صرف عبادات کی حد تک محدود رکھا گیا ہے، لیکن اسلام میں اس طرح نہیں ہے، اس میں انسانی زندگی کے تمام اعتقادی اور عملی پہلوؤں کو مذہب کی رہنمائی میں رکھا گیا ہے اور اس طرح مذہب کو پوری زندگی کے لئے رہبر بنایا گیا ہے، اور یہ رہبری ایسی رکھی گئی ہے جو انسانی فطرت سے ہم آہنگ ہے اور اس کی سہولت کے لحاظ سے اس میں کوئی دشواری نہیں رکھی گئی ہے، بلکہ انسان کی ضرورتوں اور مصلحتوں کا اس میں لحاظ رکھا گیا ہے۔

اس طرح مسلمانوں کو اپنی زندگی کے ہر پہلو میں یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ اس کے پیدا کرنے والے اور اس کی زندگی کو تمام اسباب راحت عطاء کرنے والے اس کے پروردگار کی پسند کیا ہے، پھر اس کی پابندی کرنا ہوتی ہے، اور اس کے رب کی پسند اس کے رسول اللہ ﷺ پر اتری ہوئی وحی کے ذریعہ اور عملی زندگی میں ان کی اختیار کردہ تمام باتوں کو قابل تقلید مثال قرار دیکر پوری طرح واضح کردی گئی، مسلمانوں کو اس کی پابندی کرنا ہوتا ہے، ایسا معاشرہ اسلامی تاریخ میں جب اور جہاں قائم ہوا اس میں انسانی زندگی کی ایسی خوبیاں نمایاں ہوئیں جو انسان کی دیگر مخلوقات پر برتری کی اعلیٰ مثال بنیں۔

انسانی زندگی کی وہ خصوصیات جو رب العالمین کی طرف سے بتائی گئی ہیں، ان میں ایک دوسرے کی خیر خواہی، کمزوروں کی مدد، آپسی محبت ومودت، ظلم وخودغرضی سے پرہیز، مال ودولت اور دنیاوی منفعت کو صرف ضرورت کی حد تک رکھنے پر اکتفا اور اپنے پروردگار کی خوشنودی کو دوسرے مقاصد پر ترجیح دینا، وہ اعلیٰ صفات ہیں جو انسانی معاشرہ کو جنت ارضی بنادیتی ہیں، مسلمانوں کو ایسا ہی معاشرہ تشکیل دینے کو کہا گیا ہے۔

اسلامی معاشرہ یا مسلمانوں کا معاشرہ یہی معاشرہ ہے جس کی رب العالمین کی بھیجی ہوئی وحی کے ذریعہ تلقین کی گئی ہے، اور اسی کی پابندی پر رب العالمین کی طرف سے خوشنودی حاصل ہوتی ہے اور برکت ورحمت کا نزول ہوتا ہے، اور اس کے بغیر آخرت میں کامیابی نہیں ملتی، بلکہ دنیا میں بھی خیر وخوبی حاصل نہیں ہوتی اور خلاف ورزی کی صورت میں آخرت میں مصیبت سے سابقہ پیش آئے گا، اور دنیا میں بھی عموماً پریشانیوں سے سابقہ پڑسکتا ہے، اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام الٰہی میں بھی اس کو صاف واضح کردیا ہے، کہ مسلمان جیسی زندگی گذاریں

گے اسی کے مطابق ان کو اس کے نتائج دیکھنے ہوں گے، یعنی نافرمانی کی صورت میں ان کو تکلیفیں یا مصیبتیں پیش آسکتی ہیں، ان کے ظاہری اسباب دنیاوی معلوم ہوں گے، لیکن ان کا اصل سبب ان کے اعمال کی خرابی ہوگی، ارشاد خداوندی ہے کہ﴿ و ما أصابكم من مصيبة فبما كسبت أيديكم و يعفو عن كثير﴾ [الشوری: ۳۰] (اور جو مصیبت تم پر واقع ہوتی ہے سو تمہارے اپنے فعلوں سے ہے اور وہ بہت سے گناہ تو معاف ہی کر دیتا ہے) اور اللہ تعالی نے اپنے کلام الٰہی میں یہ بھی فرمادیا کہ اس نے اس میں مسلمانوں اور دوسری قوموں کو جو اپنے کو آسمانی مذہب کی تابعدار سمجھتی تھیں اور اہل کتاب کہی جاتی ہیں اس بارے میں یکساں رکھا ہے کہ ان میں سے جو بھی جیسا کرے گے ویسا ہی نتیجہ دیکھے گا۔

ہماری انسانی زندگی میں عبادات کا پہلو تو مذہبی اہمیت وخصوصیت کا سمجھا ہی جاتا ہے، لیکن زندگی کے عام معاملات، اخلاق اور دیگر طور طریق کے سلسلہ میں عموماً اس بات کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے کہ ان کے سلسلہ میں بھی مذہبی ہدایات ہیں اور ان کی تابعداری ٹھیک طور پر کرنے پر ان طور طریق کو بھی عبادات کا درجہ حاصل ہو جاتا ہے، اور مذہبی ہدایات کی صحیح پابندی نہ ہو تو عبادات کے پہلو بھی عبادات کے فائدہ سے خالی ہو جاتے ہیں، اس لئے بہت ضروری ہے کہ زندگی کے سارے پہلوؤں میں رب العالمین کی طرف سے دی گئی ہدایات کی پابندی کی جائے، اسی لئے مسلمانوں کے مذہبی رہنما برابر زندگی کے تمام پہلوؤں میں احکام الٰہی کی تابعداری کی طرف توجہ دلاتے رہتے ہیں اور اس کا فائدہ بھی یہ ہوتا ہے کہ مسلمانوں میں ایک تعداد برابر ہر عہد میں اسلام کی اس جامع اور ہمہ جہت خصوصیت کو اپناتی رہی ہے۔

یہ اور اس طرح کی دیگر باتیں میں نے وقتاً فوقتاً قارئین کے لئے عرض

کیں، ان میں سے خاص طور پر وہ تحریریں جو ندوۃ العلماء سے شائع ہونے والے رسالہ ''تعمیر حیات'' کے مختلف شماروں میں شائع ہوئیں یا پہلے عربی رسالہ ''الرائد'' میں شائع ہوئیں اور پھر ترجمہ ہو کر ''تعمیرات حیات'' میں شائع ہوئیں، اور وہ ''تعمیر حیات'' کی فائلوں میں منتشر تھیں، ان کو عزیزی مولوی محمود حسن حسنی ندوی اور عزیزی مولوی محمد وثیق ندوی نے وہاں سے نکالا اور موضوع کے لحاظ سے ترتیب دیکر جمع کر دیا اور اس مجموعہ کو لائق اشاعت بنا دیا، امید ہے کہ یہ کام فائدہ سے خالی نہ ہوگا، میں دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ ان جمع کرنے والوں اور مرتبین کو جزائے خیر دے اور صاحب مضامین کو بھی اجر سے محروم نہ کرے۔

محمد رابع حسنی ندوی
دائرہ شاہ علم اللہ، تکیہ، رائے بریلی

۲۴/ ربیع الثانی/ ۱۴۳۰ھ
۲۱/ اپریل/ ۲۰۰۹م

باب اول

ثقافت و تعلیم

- اسلامی ثقافت
- دینی تعلیم کی اہمیت وضرورت
- دینی مدارس، اہمیت، افادیت اور ضرورت
- جدید نظام تعلیم میں اصلاح کی ضرورت
- مسلمانوں کی تعلیم میں ترقی کی ضرورت اور قابل توجہ پہلو
- مسلمانوں کی نئی نسل کی تربیت کی ضرورت
- اولاد کی تعلیم وتربیت
- دینی وتعلیمی کام کی اہمیت وضرورت

اسلامی ثقافت

ثقافت کسی بھی قوم کی زندگی کا ایک اہم عنصر تصور کی جاتی ہے، وہ ایک قوم کو دوسری قوم سے ممتاز بھی کرتی ہے، اور اس کی ایک امتیازی پہچان بھی بنتی ہے، اور قوم کی تہذیبی اور تمدنی ترقی کی نشاندہی بھی کرتی ہے۔

ثقافت کوئی ایسا لباس نہیں ہے جو دوسروں سے مستعار لیا جا سکے، اس کا خمیر قوم کی داخلی زندگی سے اٹھتا ہے، زندگی کی قدریں اور تصورات اس کے تانے بانے تیار کرتے ہیں اور اس کے خدوخال واضح کرتے ہیں، لہٰذا جو قوم اپنی زندگی کے اندرون اور اس کے حقیقی تصورات سے اپنی ثقافت وضع کرنے کی قدرت نہیں رکھتی اس قوم کی اپنی کوئی شناخت نہیں ہوتی، اس کی شخصیت کسی دوسرے کی تابع ہوا کرتی ہے، مستعار لیے گئے اخلاق اور مسخ شدہ تصورات کا پیوند اس پر لگا ہوتا ہے، اور یہ اس قوم کی دورنگی زندگی کا آئینہ دار ہوتی ہے۔

اقوام مشرق اور آخری زمانہ میں قوم مسلم بھی عام طور پر اس دورنگیت کا شکار ہوئی، یہ سانحہ اس وقت پیش آیا جب یورپین یلغار نے اپنی زندگی کے تصورات

کو ان اقوام کی ثقافت وعقلیت میں راسخ کر دینے میں کامیابی حاصل کی، مغربی تہذیب کی چمک دمک نے مشرقی اقوام کی نگاہوں کو اس درجہ خیرہ کر دیا کہ پھر وہ یہ نہ دیکھ سکیں کہ خود ان کی خاکستر میں کیسی چنگاری پوشیدہ ہے، کیسے کیسے فکری اور ادبی جواہر سے ان کا اندرون مالا مال ہے، اور خود ان کی شخصیت میں ایسی خصوصیات پوشیدہ ہیں جو ان کو کسی دوسرے کا ریزہ چیں بننے کا محتاج باقی نہیں رکھتیں، پھر قوم مسلم کو دنیا کی تمام اقوام میں یہ امتیاز حاصل ہے کہ اس کا ذہن ثقافت کے مضبوط عناصر سے بے انتہا مالا مال ہے، بلکہ اس کی قوت اور خزانہ تو دوسری کتنی اقوام کو مالا مال کر دینے کی صلاحیت رکھتا ہے، امت مسلمہ کے اندر یہ صلاحیت اس سبب سے پیدا ہوئی کہ اس نے تہذیب وتمدن کے سایہ میں زندگی گذاری، اس کے پاس آسمانی دین تھا، اپنے افکار اور آداب تھے، یہی وہ اہم عناصر ہوتے ہیں جن سے کسی بھی قوم کی زندگی کا ثقافتی ڈھانچہ تیار ہوتا ہے، لیکن حیرت تھی کہ مغربی تمدن کی جلوہ افروزیوں نے اس ممتاز قوم کے فرزندوں کی نگاہیں چکا چوند کر دیں، اب ان کے طائر فکر وخیال کی پرواز محدود ہو کر رہ گئی، یہ پرواز اسی فضا میں سمٹ کر رہ گئی جسے مغرب نے تیار کیا تھا، اب انہیں وہی نظر آتا ہے جو مغربی زندگی انہیں پیش کرتی، تصور مغرب کا قرار پایا، معیار شرافت وعزت پر مغرب کی چھاپ ہوئی، اور مغرب کے بنائے ہوئے خول سے نکلنا اس کے لیے ممکن نہیں رہ گیا، یہ انتہائی درجہ افسوسناک امر تھا، جو ثقافتی اور تمدنی تصورات کے میدان میں چھا چکا تھا، امت مسلمہ نے خود اپنی ذات پر اعتماد کھو دیا، اپنی عزت واقبال کا احساس جاتا رہا، اپنی ذات خود اپنی نظر میں بے قیمت ہو گئی، اپنے سرمایہ ومیراث پر ناز نہیں رہا، فکری، دینی، ثقافتی اور تمدنی تاریخ کے روشن صفحات نگاہوں سے اوجھل ہو گئے، لیکن پھر مشیت الٰہی کا فیصلہ ہوا کہ یہ دور احساس زبوں دراز نہ ہو، مسلم دانشور اور مفکرین نے

انگڑائی لی، انہیں اپنا بیش قیمت فکری سرمایہ نظر آیا، اور وہ اپنی فکری وثقافتی عظمت کی بازیافت میں مصروف ہوگئے، قوم کو بھولا سبق یاد دلایا، اور آج اس کے آثار ہماری نگاہوں کا سرمہ بن رہے ہیں کہ بحث ومکالمہ اور ذہنی ترقی کے لیے مجلسوں کا انعقاد ہورہا ہے، اس بات کی ضرورت محسوس کی جارہی ہے کہ امت کی اصلاح حال کا سامان کیا جائے امت کے ڈھانچہ کی تعمیر کے لیے حکمت عملی تیار کی جارہی ہے، ان سب کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

ثقافتی حکمت عملی وضع کرتے وقت یہ ضروری ہے کہ اس امت کے دین، اخلاق اور اس کے تصورات کے سرچشموں سے وہ حکمت وضع کی جائے۔

کسی بھی قوم کے ثقافتی ڈھانچہ کے بڑے حصہ پر دینی تاثیر کا رنگ چڑھا ہوتا ہے، عام طور پر توجہ اس طرف نہیں جایا کرتی ہے، لیکن ایک گہری نظر سارے حقائق بے نقاب کردیتی ہے۔

مسیحی زندگی

مغرب کی مسیحی زندگی کو لے لیجے صلیب آپ کو جگہ جگہ نظر آئے گی، عمارتوں میں، مختلف تمدنی اور ثقافتی مظاہر میں صلیب کی شکل بنی ہوتی ہے، عمارتوں کے گیٹ اور گنبد بسا اوقات گرجا گھروں کے گنبدوں اور گیٹوں کے ہم شکل ہوتے ہیں، صحت سے متعلق مراکز اور امدادی تنظیموں کے نشانات بھی صلیب کی شکل پر بنے ہوتے ہیں، کبھی کبھی تو دیواروں کی بناوٹ بھی صلیب کی شکل اختیار کیے ہوتی ہے، گلوں میں لٹکے ہاروں میں صلیب کی شکل ملے گی، یہ وہ چیزیں ہیں جن کا بڑی شدت سے استعمال متمدن لوگ کرتے ہیں اور ان کا استعمال نہ کرنا بے ادبی اور کم مائیگی تصور کرتے ہیں، حالانکہ یہ سب دینی اور مذہبی نشانات ہیں، تصورات مغرب میں مسیحی

مذہبی تصورات کے تابع ہوتے ہیں" کرسمس کا جشن" بہت ہی بڑے پیمانہ پر اور مخصوص انداز میں منعقد کیا جاتا ہے اور" گڈ فرائیڈے" وغیرہ یہ سب اسی طرح کی چیزیں ہیں۔

تعلیم میں پرائمری سے یونیورسٹی گریڈ تک مختلف مذہبی شعائر سیکولر ثقافتی مظاہر کے طور پر پیش کیے جاتے ہیں، مغرب کی دورنگی دیکھئے کہ مشرقی تعلیم گاہوں میں مسجد کی تعمیر کو وہ پسماندگی اور رجعت پسندی قرار دیتا ہے لیکن مغرب کی بڑی بڑی یونیورسیٹوں اور اداروں میں گرجا گھروں کی تعمیر اور مذہبی رسومات کی ادائیگی پر سختی کے ساتھ کاربند ہے۔

یہود کا حال

یہودیوں کی زندگی میں تو مذہبی شدت انتہا درجہ کی ہے، اسی کا ایک مظہر یہ ہے کہ پوری دنیا کے یہود فسلطین میں اپنی جابرانہ حکومت کو بھرپور تعاون پیش کررہے ہیں، فلسطین کی غصب شدہ سرزمین پر یہودی آبادکاری کی جارہی ہے، اور ساتھ ہی یہ بھی دعویٰ ہے کہ ہم سیکولر اور روشن خیال ہیں۔

ہندوؤں کا حال

ہندوستان کے ہندوؤں کا حال بھی اس سے مختلف نہیں۔ یہ بہت سے قدیم ہندوانہ اخلاق کو مضبوطی سے تھامے ہوئے ہیں، جن میں سے اکثر کا تعلق ان کے اجتماعی آداب، کھانے پینے اور شادی ولباس کے طور طریق سے ہے، ان کے بعض رسم ورواج بہت تعجب خیز حد تک پہنچ جاتے ہیں، اور یہ سب کھلم کھلا انفرادی اور اجتماعی زندگی میں نظر آتے ہیں، پتھروں کے سامنے کھڑے ہوکر اظہار عاجزی

کرتے ہیں، لوگوں نے ترقی کے کتنے زینے طے کر لیے، کتنی ترقی اور وسعت ذہنی آ گئی، لیکن ابھی تو ہمات کے دائرے میں رہتے ہوئے خوف اور خود ساختہ تصورات کے سامنے سر افگندگی اب بھی باقی ہے۔

مسلم ثقافت پر اعتراض کیوں؟

اکثر باتوں کا تعلق مذہبی تصورات سے باقی ہے، انہیں قبولیت عامہ حاصل ہے، متمدن دنیا کی ہر قوم نے انہیں سر آنکھوں پر رکھا ہے، انہیں رجعت پسندی اور عقلی پسماندگی کا نام نہیں دیا جاتا، لیکن اسلامی ثقافت جو تمام خرافاتوں سے پاک ہے انہیں وزن دینے میں دنیا کو پس و پیش ہوتا ہے، حالانکہ دنیا کی ہر طرح کی لیاقتوں کے مقابلہ میں اسلامی ثقافت بہت معیاری، مثبت اور صحت مندانہ ہے، علمی ذہن کو مطمئن کرنے والی اور زندگی کی حقیقتوں کو سمیٹے رکھنے والی ہے۔

اسلامی ثقافت کے مظاہر

اس اسلامی ثقافت کے مظاہر چار بڑے گوشوں میں پھیلے نظر آتے ہیں۔

۱- دین اور اخلاق کا دائرہ

۲- سماجی زندگی کا دائرہ

۳- علم کے میدان

۴- ذوق جمیل کے گوشے

دین و اخلاق

دینی میدان میں دیکھا جائے تو اسلامی ثقافت کے مظاہر عبادتوں اور

تعبدی کاموں کے سلسلے میں نظر آتے ہیں، خوبصورت مسجدوں کی تعمیر، مساجد کی سرگرمیاں، وہاں آمد ورفت، مذہبی کاموں کی مشغولیت مثلاً عیدوں کا اہتمام، رمضان کے روزوں کے سلسلہ کی مختلف النوع باتوں کا اہتمام، حج اور اس کے شعائر سے تعلق رکھنے والے کام، وعظ کی محفلیں اور ان کے انعقاد وشرکت کے معاملات، دعوت وتبلیغ کی مجلسیں اور ان کے اہتمام کی راہیں، اللہ، رسول اور مسلمانوں کی خیرخواہی کی کوششیں وغیرہ، یہ سب اسلامی ثقافت کے دینی پہلوؤں سے وابستہ امور ہیں۔

اخلاقی اعتبار سے لیجئے تو قرآن کریم اور احادیث نبویہ میں ایسی ہدایات اور تعلیمات بکھری ملتی ہیں کہ اگر پوری دنیا کے اہل دانش وعقل جمع ہوکر کوئی ایسا مجموعہ تیار کرنا چاہیں تو اس مجموعہ کے مساوی بھی لانا ہرگز ان کے لیے ممکن نہ ہوسکے گا، قرآن اور حدیث کے سرچشموں سے تیار ہونے والے بہترین اخلاق اور عمدہ انسانی کردار کے مجموعہ کے جستہ جستہ اوراق ذیل میں ملاحظہ کیجئے۔

فضول خرچی اور بخل دونوں سے بچنے کا حکم دیا گیا ہے، قرآن میں ارشاد ہے:

﴿وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُولَةً إِلَىٰ عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُومًا مَّحْسُورًا﴾ (بنی اسرائیل: ۲۹)

''اور اپنے ہاتھ کو نہ تو گردن سے بندھا ہوا (یعنی بہت تنگ) کرلو کہ کسی کو کچھ دو ہی نہیں اور نہ بالکل ہی کھول دو (کہ سبھی کچھ دے ڈالو اور انجام یہ ہو) کہ ملامت زدہ درماندہ ہوکر بیٹھ جاؤ''

سچائی، پاک دامنی اور امانت داری اختیار کرنے کا حکم دیا گیا، نیز تکبر، خود پسندی اور گھمنڈی کو چھوڑ کر اللہ رب العزت کے لیے تواضع اختیار کرنے کی تعلیم دی

گئی، قرآن کریم نے حضرت لقمان کی زبانی یہ ہدایات نقل کی ہیں:

﴿وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحاً إِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ﴾ (لقمان:۱۸)

''اور از راہ غرور لوگوں سے گال نہ پھلانا اور زمین پر اکڑ کر نہ چلنا کہ خدا کسی اترانے والے خود کو پسند کو پسند نہیں کرتا۔''

اولاد آدم کے ساتھ مساوات اور تمام مسلمانوں کے ساتھ مخلصانہ اخوت کا سبق دیا گیا، تمام انسانوں کے ساتھ مساوات کا حکم حدیث نبوی میں ان الفاظ کے ساتھ مذکور ہے ''تم سب آدم کی اولاد ہو، اور آدم مٹی سے پیدا کیے گئے تھے، کسی عربی کو کسی عجمی پر اور کسی عجمی کو کسی عربی پر، کسی کالے کو کسی گورے پر اور کسی گورے کو کسی کالے پر کوئی فضیلت نہیں ہے، سوائے اس کے کہ تقویٰ کی بنیاد پر کوئی افضل ہو''۔

ایک دوسری حدیث میں یوں فرمایا گیا ہے ''لوگ آپس میں ایسے ہی برابر ہیں جیسے کنگھی کے دندانے''۔ نیز ایک مرتبہ حضرت عمر بن عاص کے صاحبزادہ نے ایک مصری شخص کو یہ کہتے ہوئے مارا: لو ایک شریف زادہ کے ہاتھ سے، حضرت عمرؓ نے اس پر فرمایا کہ ''خدائے برتر کی قسم تم نے کب سے لوگوں کو غلام بنا رکھا ہے، ان کی ماؤں نے تو انہیں آزاد پیدا کیا تھا۔''

والدین کے ساتھ حسن سلوک کا حکم قرآن کریم اور احادیث میں بار بار دیا گیا اور اس کی خلاف ورزی کرنے والوں کو سخت ترین دھمکی دی گئی۔

اسی طرح صلہ رحمی، پڑوسیوں کے حقوق کی ادائیگی، ایفائے عہد، راستہ سے تکلیف دہ چیز کو دور کرنے، راستہ کا حق ادا کرنے، ہر جاندار پر رحم کرنے، حتیٰ کہ جانوروں کے ساتھ بھی عمدہ برتاؤ کرنے کے احکامات دیئے گئے، حدیث میں آتا ہے کہ ایک شخص کو آخرت میں اس لیے عذاب کا مزہ چکھنا پڑا کہ اس نے ایک بلی پر ظلم

کیا تھا، اور ایک فاحشہ عورت اس سبب سے جنت میں داخل کردی گئی کہ اس نے پیاسے کتے کو پانی پلایا تھا، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ شوہر اپنی رفیقۂ حیات کے ساتھ اچھا سلوک رکھے، اس کے حقوق ادا کرے، بیوی کی دلجوئی کرنے میں ثواب رکھا گیا، حتیٰ کہ شوہر اگر خیر کی نیت سے بیوی کے منہ میں لقمہ بھی رکھتا ہے تو اسے آخرت میں اس کا اجر ملے گا، کیا کسی مذہب میں بیوی کا اس درجہ اکرام اور عزت افزائی کی تعلیم ملتی ہے؟ اللہ تعالیٰ نے اس بات کا بھی حکم دیا کہ بیوی کے ساتھ نرمی و مہربانی کا رویہ رکھا جائے، رسول اکرم ﷺ نے فرمایا کہ عورت پسلی سے پیدا کی گئی ہے اور پسلی سیدھی نہیں کی جاسکتی ہے اس کو (عین مرد کے مزاج کے مطابق بنانے کے لیے) سیدھا کرنا مناسب نہیں، وہ ٹوٹ جائے گی، عورتوں کے قافلہ کو لے چلنے والے سے آپ ﷺ نے فرمایا: نرمی اختیار کرو، یہ آبگینے ہیں، خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ازواج مطہرات کے ساتھ نرمی و اخلاق کا معاملہ فرماتے تھے، حضرت عائشہؓ کے ساتھ آپ کا خاص معاملہ رہا کرتا تھا، ان کی دلجوئی کے لئے ان سے کھیل کے بارے میں بھی پوچھتے تھے، ایک دن حبشیوں کی نیزہ بازی کا کھیل دکھلایا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم فرمایا کہ چھوٹوں پر شفقت کی جائے بڑوں کا احترام کیا جائے، سلام کو رواج دیا جائے، سلام کو باہمی محبت میں فروغ کا سبب بتایا، مسلمانوں کے مابین سلام کا رواج اسلامی ثقافت کا ایک مظہر ہے، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم آپس میں مساوات اختیار کرنے کا حکم فرماتے تھے، خود جب کسی مجلس میں تشریف لاتے تو مجلس کے آخر میں جہاں پر جگہ ہوتی بیٹھ جاتے، آپ ﷺ کا فرمان تھا کہ لوگ آپ ﷺ کے واسطے کھڑے نہ ہوا کریں، بخاری شریف میں اس کی حدیث وارد ہوئی ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: تم اس طرح مت کھڑے ہوا کرو جس طرح عجمی کھڑے ہوتے ہیں اور ایک دوسرے کی تعظیم کرتے ہیں، آپ ﷺ نے مہاجرین اور انصار کے

درمیان ایسی مواخات قائم فرمائی تھی جو رشتہ داری کی مواخات کے مشابہ تھی، ایک مسلمان کو دوسرے مسلمان کے لیے رشتہ کا بھائی جیسا قرار دیا، اور فرمایا: تم میں سے کوئی اس وقت تک مومن نہیں ہوسکتا جب تک کہ وہ اپنے بھائی کے لیے وہ پسند نہ کرے جو اپنے لیے پسند کرتا ہے، گویا آپ ﷺ نے مسلمانوں کے درمیان مواخات کو ایمان کا دارومدار قرار دیا۔

ان اخلاقی پہلوؤں سے مسلمانوں کا ثقافتی چہرہ ایک پسندیدہ اور دلکش صورت میں ظاہر ہوتا ہے، مساوات، رحمدلی، ترقی، مواخات اور انسانیت نوازی کا جاذب نظر مظہر سامنے آتا ہے، مومن کی پوری زندگی حسن جمال اور سراپا خیر بن جاتی ہے، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مومن کی مثال کھجور کے درخت سے دی ہے، جس کا ہر ہر جز لوگوں کے لیے نفع بخش اور خیر ہوتا ہے۔

سماجی زندگی

سماجی زندگی میں دیکھئے تو اسلامی ثقافت کے مظاہر مختلف جگہوں پر نظر آئیں گے، خانگی زندگی، مدرسہ، مسجد، مجالس، بازار، تجارت اور سیاست وغیرہ ان سب میدانوں میں اسلامی تعلیمات بکھری ملیں گی، اور یہ میدان نہایت توازن اور اعتدال کے ساتھ آراستہ کیے ہوئے نظر آئیں گے۔

تجارتی میدان میں آیئے، کسی مسلمان کو اس بات کی اجازت نہیں ہے کہ وہ دھوکہ یا چالبازی کرے، سامان کی کسی خرابی کو چھپا کر اسے فروخت کردے، ایک آدمی معاملہ کر رہا ہے تو اس پر معاملہ کرے، یا اپنی تجارت کے ذریعہ دوسروں کا حق مارے، اسی طرح یہ بھی جائز نہیں کہ اپنی پوری کوشش اس بات پر صرف کردے کہ خزانوں اور دولتوں کا انبار اکٹھا ہوجائے اور فقراء و

مساکین اور دیگر ضرورت مندوں کا خیال نہ رکھے، اللہ تعالیٰ نے مختلف قوانین و ضوابط کے ذریعہ مالی پہلو کو بالکل متوازن بنایا ہے۔

سیاسی میدان

سیاسی میدان میں اتریئے تو اسلام سب سے پہلے یہ حکم دیتا ہے کہ منصب وعہدہ ایسے شخص کو نہیں سونپا جائے گا جو اس کا طالب ہو اور اس کا مشتاق ہو، البتہ اگر کسی کے پاس اس کی طلب کے بغیر آجائے تو پھر قبول کرنا درست ہے، لیکن جو شخص عہدہ طلب کر رہا ہو، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر میں وہ عہدہ کا اہل نہیں ہے، ہاں اگر اسلام اور مسلمانوں کی کوئی واقعی اور اہم ضرورت پیش آجائے تو طلب کرنے کی گنجائش ہے، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عہدہ کے پاس امانت قرار دیا، نہ کہ کوئی ایسا وظیفہ اور ذریعہ جس سے مالی منفعت وابستہ ہو، اس بات میں کوئی دورائے نہیں کہ آج کے اکثر سیاسی فساد اور بگاڑ کا سرچشمہ یہی ہے کہ منصب وعہدہ کی درخواست ایک شخص عوام کے سامنے اس طرح پیش کرتا ہے جیسے وہ کوئی وظیفہ ہو، پھر اس کے حصول کے لیے سارے جتن کر ڈالتا ہے، ہر صحیح اور پروپیگنڈہ کا موجودہ مروج طریقہ پوری فضا کو آلودہ کر دیتا ہے، نہایت درجہ گھناؤنی تصویریں سامنے آتی ہیں جو سب سے پہلے عوام کے دلوں سے برائی کے احساس کو ہلکا کر دیتی ہیں اور وہ جرائم قابل قبول بن جاتے ہیں، پھر پوری قوم کی ثقافتی روح اس سے متاثر ہوتی ہے، صدق وسچائی، پاکیزگی، مکارم اخلاق اور عزت نفس جیسی صفات دفن ہو جاتی ہیں، اور اسی گوشت پوست کے انسان سے ایک فروخت کنندہ اور ایک خریدار کی شخصیت ابھرتی ہے، بلکہ ایک چالباز اور فریب دہندہ کی تصویر سامنے آتی ہے۔

اس جمہوری نظام ہی کے ہم مثل جابرانہ آمرانہ نظام بھی ہے، وہ نظام

لوگوں کے اندر چاپلوسی، خودغرضی اور شدت وظلم پیدا کردیتا ہے، پھر لوگوں کی دو قسمیں ہوجاتی ہیں، ایک ظالم وجابر ودوسرا مظلوم وبے بس، ان دونوں قابل صد نفریں طریقوں سے مفر صرف اسی نظام اور طریقہ میں ہے جس کی فکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش کی ہے، یعنی مساوات کی فکر، لوگ برابر ہیں، سب کے سب ایک آدم سے پیدا کیے گئے ہیں، اگر کسی کو برتری ہے تو صرف اپنے عمل وکردار میں احتیاط اور خوف خدا کی بنیاد پر، اور سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا ایک بڑے حاکم کو مخاطب کرکے کہنا کہ ''کب سے تم نے لوگوں کو غلام بنالیا ہے، ان کی ماؤں نے تو ان کو آزاد جنا تھا'' ان غلط سیاسی نظاموں کی اصلاح نہایت ضروری ہے اور وہ اسلام کی صحیح فکر ہی پیش کرنے سے ہوگی۔

علم کا میدان

علم کے میدان میں آیئے تو اسلام میں حصول علم کی بڑی تاکید ملے گی، جس کی مثال دوسرے مذاہب میں نہیں ملے گی، بلکہ دوسرے انسان کے بنائے نظاموں میں بھی نہیں ملے گی، تعلیم کی اہمیت کو قرآن کی سب سے پہلی وحی میں سراہا گیا، قلم علم کی سب بڑی اور بنیادی علامت ہے، اللہ تعالیٰ نے قلم کی قسم کھائی ہے، قرآن کریم کے مختلف مقامات پر انسان کی تعلیم کا تذکرہ ہے

﴿و علم آدم الأسماء كلها﴾

''اور اس نے آدم کو (سب چیزوں کے) نام سکھائے''

ظاہر ہے کہ ناموں اور اصطلاحات میں ہی علم کی کنجیاں ہیں، نیز فرمایا:

﴿علم الإنسان مالم يعلم﴾

''انسان کو وہ باتیں سکھائیں جن کا اس کو علم نہ تھا''

﴿إنما يخشى اللهَ من عباده العلماءُ﴾

''خدا سے تو اس کے بندوں میں سے وہی ڈرتے ہیں جو صاحب علم ہیں''

﴿الذين يتفكرون في خلق السماوات والأرض ربنا ما خلقت هذا باطِلاً سبحانك فقنا عذاب النار﴾۔

(اور آسمان اور زمین کی پیدائش میں غور کرتے (اور کہتے ہیں) اے پروردگار تو نے اس (مخلوق) کو بے فائدہ نہیں پیدا کیا۔ تو پاک ہے اور اے اللہ تو ہمیں آگ کے عذاب سے بچا''

علم کے بند دروازے کھولنے کا بہت ہی وسیع بنیادی طریقہ ہے، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کو حصول علم کی ترغیب دی، کتابت (لکھنا) سیکھنے کا حکم فرمایا جو حصول علم ہی کا طریقہ ہے۔

ہمیں جس علم کی ضرورت ہے اس کی دو قسمیں ہیں: ایک وہ قسم جس کا تعلق آخرت سے ہے، یہ علم ہمیں بتاتا ہے کہ انسان کا اپنے رب سے کیا تعلق ہونا چاہئے، اس پر آخرت میں کیا نتائج مرتب ہوتے ہیں، اور دنیا میں اس کے کیا تقاضے ہیں، تاکہ انسان آخرت میں اجر کا مستحق بن سکے، یہ علم انبیاء اور رسولوں کے واسطہ سے آتا ہے، ان کے جانشیں پھر ان کے پیروکار اس علم کی تشریح کرتے ہیں اور عام کرتے ہیں، سب سے آخری نبی سیدنا حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھے، وہ جو علم لے کر آئے اور جو اس سلسلہ میں ہدایات عطا فرمائیں وہ آخری احکام قرار پا گئے، اب اس میں نہ کمی کی جا سکتی ہے اور نہ اضافہ، صرف اس کی تشریح و توضیح کا کام جاری رہے گا، کیونکہ وہ کسی انسان کا علم نہیں ہے بلکہ خالق انسان کا علم ہے۔

علم کی دوسری قسم

دوسری قسم علم کی وہ ہے جس کا تعلق اس دنیا اور انسانی زندگی سے ہے، یہ علم انسان کی صلاحیت وفکر کی جولان گاہ ہے، اسی قسم کے سلسلہ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''یہ تمہاری دنیا کے امور سے متعلق ہے، اس میں انسان اپنی فکر اور اپنے تجربوں سے وسعت پیدا کرتا رہتا ہے، نئی نئی تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں، نئے نئے آفاق دریافت ہوتے رہتے ہیں، اسی علم کے ذریعہ انسان دنیا کا رخ پھیرتا ہے، نئے رازوں کا انکشاف کرتا ہے، گویا راستہ کھلا ہے اور انسان صاحب اختیار ہے، اس علم سے جس قدر چاہے اپنے مفاد کی خاطر استفادہ کرے، اس شرط کے ساتھ کہ اسلام اور علم آخرت سے تعارض نہ پیدا ہونے پائے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انسان کو اس سلسلہ میں مختار قرار دیا ہے، فرمایا! تم اپنی دنیا کے امور سے زیادہ واقف ہو، بلکہ اس سلسلہ میں شریعت کے دونوں مصادر قرآن اور حدیث میں محنت وکاوش کرنے کا حکم دیا گیا ہے، چنانچہ مسلمانوں نے اپنی قوت وشوکت کے ایام میں اس پر کافی توجہ مبذول کی اپنی تحقیق وتجربوں سے اس علم کو مالا مال کیا، اس کا دائرہ خوب سے خوب وسیع کیا، یہ قصہ اس وقت کا ہے جب مغرب پر نیند طاری تھی، لیکن بعد کے زمانہ میں مسلمانوں نے سستی دکھائی ان پر بھی نیند طاری ہوگئی، دوسری طرف مغرب بیدار ہو چکا تھا، اپنے سابق حاصل کئے ہوئے علم سے خوب فائدہ اٹھا رہا تھا جس میں مسلمانوں کا علم بھی تھا اور دنیا کے علم میں پوری طرح سرگرم ہو چکا تھا، نتیجہ ظاہر تھا، انہیں اپنی کوشش کا پھل ملا، اور مغرب بازی لے گیا، نئے نئے آفاق اس نے دریافت کر لیے، سامان زندگی میں انقلاب پیدا کر دیا، یہ چیز اسلام سے ٹکرانے والی نہ تھی، بلکہ مسلمانوں کے لیے اس سے گریز مفید بھی نہیں تھا، ان کے دین ومذہب نے تو

انہیں اس کے اختیار کرنے کا حکم دیا تھا، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿وأعدوا لهم ما استطعتم من قوة ومن رباط الخيل ترهبون به﴾

''اور جہاں تک ہو سکے ان کے (مقابلے کے) لیے مستعد ہو (فوج کی جمعیت کے) زور سے اور گھوڑوں کے تیار رکھنے سے''

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''تم بھی اپنے دشمنوں جیسے اسلحوں سے لیس رہو، اللہ تعالیٰ نے اس دنیا سے صالح طریقہ پر انتفاع کا حکم بھی دیا ہے فرمایا ہے:

﴿قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِينَةَ اللَّهِ الَّتِي أَخْرَجَ لِعِبَادِهِ وَالطَّيِّبَاتِ مِنَ الرِّزْقِ﴾

''پوچھو تو کہ زینت و آرائش'' اور کھانے (پینے) کی پاک چیزیں بندوں کے لیے پیدا کی ہیں ان کو حرام کس نے کیا''

یہ تمام چیزیں ہم سے تقاضا کر رہی ہیں کہ ہم اپنے دنیاوی امور میں اسی نئی پیش رفت سے بھرپور فائدہ اٹھائیں، اپنی ثقافت کو اور آراستہ کریں، خدائے عزوجل نے دنیا کی فائدہ و خوبی کی چیزوں سے فائدہ اٹھانے کی اجازت دی ہے، شرط صرف یہ ہے کہ اس استفادہ کے لیے جو حدود مقرر کر دیئے گئے ہیں، ان سے تجاوز نہ کیا جائے۔

مغربی تمدن و تہذیب کا جائزہ لیتے وقت ہمیں یہ نظر آتا ہے کہ عورت کو آخری درجہ تک آزادی دے دی گئی، ایسی کھلی چھوٹ قدیم رومی اور یونانی تہذیب سے ضرور میل کھاتی ہے لیکن اسلام سے وہ جوڑ نہیں کھاتی، اس لیے ہمارے واسطے تو نہایت ضروری ہے کہ سب سے پہلے ہمیں اسلام کی قائم کردہ

حدود معلوم ہوں، پھران حدود کی مکمل رعایات کی جائے، مغرب کے اندر مذہب کو عبادت گاہوں میں محدود تصور کیا جاتا ہے، لیکن ہمارے اسلام میں مذہب کا دنیا سے تعارض نہیں ہے، مذاہب کا دائرہ صرف مسجدوں کے اندر سمٹ کر نہیں رہ جاتا ہے، بلکہ وہ زندگی کے ہر گوشہ میں داخل ہوتا ہے اور رہنمائی کا فریضہ انجام دیتا ہے۔

ثقافت کے میدان میں بھی ہمیں اس اہم نکتہ کو سامنے رکھنا ہوگا، چنانچہ ادب وفن کے میدانوں میں بھی یہ بات لازم ہوگی کہ وہ اسلامی تعلیمات سے ٹکراتے نہ ہوں، خدائی قانون کے حدود سے وہ آزاد نہ ہوں۔

ادب وفن کے میدان میں ہمیں کس حد تک آزادی حاصل ہے، اس کا اندازہ لگانے کے لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ اور آپ ﷺ کی تعلیمات پر ایک نظر ڈالنا کافی ہوگا۔

دینی تعلیم کی اہمیت وضرورت

مسلمانوں میں اس وقت ان کے ہر ملک میں تعلیم کی اہمیت کو اچھا خاصا محسوس کیا جانے لگا ہے، اس کے مسائل اور تقاضوں پر غور کرنے کے لئے مسلمانوں کے دانشور اور باشعور افراد کے مشاورتی اجتماعات بھی منعقد ہوتے ہیں، اور ضرورت کے احساس کے ساتھ علمی تدابیر بھی اختیار کی جاتی ہیں، اس کی وجہ سے مسلمانوں کی نئی نسل کے لئے تعلیم کا انتظام کرنے کا رجحان عام ہو گیا ہے، اگرچہ مطلوبہ مقدار اور ضرورت کے لحاظ سے یہ ابھی کم ہے لیکن جتنا ہے وہ ایک فال نیک ہے۔

آزادی سے قبل تعلیم کی ضرورت کو اس اہمیت اور وسعت کی نظر سے نہیں دیکھا جاتا تھا، برطانوی اقتدار کے تحت زیادہ تر کلرک اور آفیسر سطح کے افراد تیار کرنے کو اہمیت دی جاتی تھی، زندگی کو ہمہ جہتی ترقی دینے کی ضرورت کے لئے تعلیم کی افادیت کو عموماً نظر انداز کیا جاتا تھا، آزادی کے بعد ہنر مند افراد تیار کرنے کی ضرورت کو بہت محسوس کیا جانے لگا اور مضامینِ تعلیم میں نسبتاً سائنس کے شعبوں کی طرف توجہ بڑھی اور سائنس کے نظری اور عملی دونوں پہلوؤں کو اختیار کیا گیا۔

مسلمانوں کی تعلیم کے مختلف عناصر میں ایک بڑا اور بنیادی عنصر دینی تعلیم کا رہا ہے، اس کو مسلمانوں نے آزادی سے قبل بھی اس کا مقام دینے کی کوشش کی اور اس سے تیار ہونے والے افراد نے ملت کی دینی ضرورت کو خاصی حد تک پورا کیا اور ان میں سے ایک تعداد نے آزادی کی جنگ میں بھی نمایاں حصہ لیا اور قربانیاں دیں پھر آزادی کے بعد بھی یہ دینی تعلیم قائم رہی بلکہ اضافہ ہوا۔ دینی علوم کے مدارس اور جامعات مزید قائم کیے گئے اور قائم کئے جا رہے ہیں، اور وہ قوم کو اس کی دینی ضرورت کے افراد ایک حد تک مہیا کر رہے ہیں۔

تعلیم کے مادی اور خالص دنیاوی عناصر کی اہمیت کا زیادہ احساس رکھنے والے کچھ افراد دینی علوم کی تعلیم کے بندوبست کو زائد از ضرورت انتظام قرار دیتے ہیں یہ لوگ دراصل دینی تعلیم کی اہمیت کا پورا اندازہ نہیں رکھتے، مسلمانوں کو مسلمان باقی رکھنے اور ان میں اسلامی واقفیت اور صلاحیت پیدا کرنے کے لئے یہ دینی علوم کی درس گاہیں بنیادی کردار انجام دیتی ہیں، ان کو امت کی دینی ضرورت کے لحاظ سے دیکھنا چاہئے۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ عہد جدید کے مسلم تعلیم یافتہ طبقہ کا مغربی فکر و تہذیب کے اثر نے ایک طرف یہ ذہن بنایا کہ وہ دین کو انسان کا صرف ایک ذاتی مسئلہ اور ایک کم اہمیت کا ایسا معاملہ سمجھنے لگے کہ وہ رہے یا نہ رہے اس سے انسانی زندگی میں کوئی خاص فرق نہیں پڑتا، حالانکہ مسلمان قوم کے لئے اس کا دینی عقیدہ اس کے تحت عملی زندگی ان کے لئے بنیادی حیثیت کی مالک ہے، اسی طرح مدارس دینیہ دینی تقاضہ اور ضرورت کے تحت جو کام انجام دے رہے ہیں مسلمان کی زندگی میں اس کی بڑی اہمیت ہے اور دلچسپ بات یہ ہے کہ مدارس کی اس اہمیت کا خود مغربی طاقتوں نے اندازہ لگا لیا ہے اور یہ سمجھ لیا ہے کہ دین کی پابندی انسان میں واقعتاً ایک خاصی افادیت پیدا کر دیتی ہے چنانچہ وہ اس زاویۂ نگاہ سے

مسلمانوں میں ابھرتے ہوئے دینی شعور کو ایک ابھرتی طاقت محسوس کرنے لگے ہیں جس کو وہ اپنی بے دینی کی زندگی اور بے حیا اور گمراہ فکر و تہذیب کے لئے خطرہ محسوس کرتے ہیں اور اس کی بنیاد پر وہ مسلمانوں کے مدارس دینیہ کو اپنی دشمن اسلام تہذیب کے لئے مضر سمجھتے ہیں۔ کیونکہ ان کے نزدیک ان مدارس سے ایسے لوگ پیدا ہو رہے ہیں جو کہ مغربی دنیا کی ملحدانہ کیفیت اور اخلاقی بیبا کی اور حیا سوزی و شخصی کردار کی آزادی کے لئے مخالف اثرات رکھنے والے، اور ان کا مقابلہ کرنے والے ہیں، افسوس کی بات ہے کہ ہمارے مغرب زدہ مسلمان دانشور بھی دینی مدارس کے مفید اثر کو نظر انداز کر کے مغرب کے منفی خیال میں اس کے ہمنوا بن جاتے ہیں۔

ہمارے یہ دینی مدارس تین طرح کے ہیں، ایک ابتدائی مدارس جن کو مکاتب کا نام دیا جاتا ہے یہ عموماً درجہ پانچ تک ہوتے ہیں ان میں اردو، قرآن مجید ناظرہ اور اچھی اخلاقی، دینی اور تہذیبی باتیں جو بچوں کی سمجھ کے مطابق ہوتی ہیں پڑھائی جاتی ہیں، ساتھ ساتھ کچھ حساب اور ہندی کی حرف شناسی بھی سکھائی جاتی ہے، ان کا معیار حکومتی پرائمری درجات کے مطابق ہوتا ہے۔

یہ نصاب تعلیم مسلمان بچوں کے لئے عقیدہ و مذہب کے لحاظ سے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے، اس سے جو مسلمان بچے محروم رہتے ہیں وہ اپنے دین و مذہب سے واقفیت میں بالکل کورے رہ جاتے ہیں، پھر اگر ان کو غیر اسلامی ماحول. ملے تو وہ اسلام سے بہت دور ہو جاتے ہیں۔

ان ہی دینی مکاتب میں بعض جگہ تین سال کا حفظ قرآن کا کورس بھی شامل کر دیا جاتا ہے جس سے بچے حافظ قرآن بن جاتے ہیں اور ان سے امت اسلامیہ کی حفظ قرآن کی ضرورت پوری ہو جاتی ہے جو اپنی جگہ پر ایک اہم ضرورت ہے جس کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں ہے۔

مکاتب کی یہ تعلیم کم از کم حفظ قرآن سے پہلے تک ہر مسلمان بچے کیلئے ضروری ہے۔

مدارس اسلامیہ کا دوسرا مرحلہ ثانوی اور اس سے اوپر کی دینی تعلیم کا ہے جس میں دینی علوم اس حد تک پڑھائے جاتے ہیں کہ امت کی دینی ضرورت کو پورا کرنے والے افراد تیار ہوں ان میں مفتی ہیں، خطیب وواعظ ہیں، معلم ہیں، داعی ہیں، مصنف ومحقق ہیں، یہ تفسیر قرآن اور فقہ وحدیث سے اتنی واقفیت حاصل کرتے ہیں جس سے وہ اپنی امت کی دینی ضرورت پوری کرسکیں۔ان کی حیثیت ایسی ہے جیسے عصری تعلیم میں کوئی میڈیکل لائن میں جاکر مریضوں کے علاج کی ضرورت پوری کرنے کے قابل بنتا ہے، اور کوئی انجینئرنگ لائن میں جاکر زندگی کی صنعتی ضرورتوں کو پورا کرتا ہے اور کوئی قانون کی تعلیم حاصل کرکے لوگوں کے جھگڑوں اور نزاعات میں مقدمات کی ذمہ داری انجام دیتا ہے، اسی طرح مسلمان کی شرعی ودینی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے عالم دین بننا ایک ناگزیر ضرورت ہے۔

دینی تعلیم کے نصاب میں تفسیر وفقہ وحدیث اہم اور خاصی مقدار رکھنے والے اجزاء ہوتے ہیں جس کے لئے دینی طالب علم کو ذرا تفصیلی طریقہ سے کئی سال لگانے ہوتے ہیں ہماری اس دینی ضرورت کو پورا کرنے والی درس گاہیں ہماری دینی زندگی کی بقا وحفاظت کے لئے ضروری ہیں اور یہ درس گاہیں عصری مضامین کی درس گاہوں کے مقابلہ میں تعداد کے لحاظ سے دس فی صد بھی نہیں ہیں اور ان کے طلبہ کی تعداد کو دیکھا جائے تو ان دینی درس گاہوں میں جانے والے طلبہ کی تعداد دیگر مضامین کی درس گاہوں میں جانے والے طلبہ کے مقابلہ میں صرف تین یا چار فی صدی نکلے گی تو کیا ہماری دینی واسلامی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے اس کے اہل علم کی یہ تعداد زندگی کی عام ضروریات کے لئے تیار کی جانے والی ۹۱-۹۲ فیصد تعداد کے مقابلہ میں گوارہ نہیں کی جاسکتی ہیں؟، امت کی خیر خواہی

رکھنے والا کوئی دانشور بھی اس بات سے انکار نہ کر سکے گا کہ دینی و اسلامی احکام و قدروں کی حفاظت کے لئے یہ از حد ضروری ہیں، لیکن صحیح جائزہ نہ لینے کی وجہ سے دینی ضرورت کے انتظام کو زائد از ضرورت سمجھا جا رہا ہے، جبکہ عملی طور پر اس کی مقدار ضرورت سے کچھ کم ہی ہے اگر اس محدود انتظام کو اور مزید کم کر دیا جائے یا اس کو دنیاوی ضرورت کے انتظام میں ضم کر دیا جائے تو ہم کو اسلام کی مذہبی تعلیمات سے واقف کرانے والے اور مذہبی احکامات اور مذہبی اعمال کی طرف متوجہ کرنے والے نیز احکام الٰہی کے بتانے والے جن کی رہنمائی میں مسلمان مسلمان رہنے کا طریقہ سیکھے، صوم صلوٰۃ، زکوٰۃ و حج نیز پیدائش اور موت، شادی و غمی ان سب میں مسلمان کے فرائض بتانے والے مطلوبہ ضرورت کے بقدر بھی نہ مل سکیں گے۔

ہمارے جدید تعلیم یافتہ لوگ جو آخرت پر اور اس میں پیش آنے والے حالات پر یقین نہیں رکھتے وہ یہ تو کہہ سکتے ہیں کہ کیا فرق پڑتا ہے مرنے والا جلایا جائے یا بلا غسل و نماز جنازہ دفن کر دیا جائے، کیا فرق پڑتا ہے قاضی نہ ملے تو "سول میرج" سے کام چلا لیا جائے کیا فرق پڑتا ہے نماز پڑھنا اور اس کے احکام جاننا، رمضان و عید کے بارے میں واقفیت ہونا آئے یا نہ آئے کیا فرق پڑتا ہے آدمی کو اپنی جوانی اور ادھیڑ عمر میں راحت و عزت ملے یہ کافی ہے مرنے کے بعد کیا ہوگا دیکھا جائے گا، تو آخرت پر یقین نہ رکھنے والے ایسا کہہ سکتے ہیں اور دینی تعلیم کی اہمیت کو کم کر سکتے ہیں لیکن جو افراد دنیاوی ضرورت کی اہمیت کو مانتے ہوئے آخرت میں پیش آنے والے معاملات پر بھی دھیان دینا ضروری سمجھتے ہیں وہ تو اس کے لئے تیار نہیں کہ ہم دنیا کی تو پوری فکر کریں اور آخرت کی راحت اور عزت کو ناقابل توجہ سمجھیں ہم کو تو اپنی دینی ضرورت کو بھی دیکھنا ہے اور اس کی مقدار کے لحاظ سے انتظام بھی کرنا ہے اس طرح اگر سو طالب علموں میں صرف تین چار طالب علم دینی

تعلیمات کے حصول کی طرف جاتے ہیں تو ان کا راستہ روکنا یا دین کی ضرورت کو غیر اہم سمجھ کر دوسری ضرورتوں کا تابع کر دینا صحیح قرار نہیں دیئے جا سکتے۔

امت اسلامیہ کی زندگی کے دونوں پہلوؤں یعنی دنیاوی ضروریات اور آخرت کی سلامتی اور کامیابی کی ضرورت کو پیش نظر رکھنا امت مسلمہ کے ذمہ دار طبقہ کی ذمہ داری ہے، امت کی طبی ضرورت کے لئے کتنے آدمی چاہئیں، انتظامی ضرورت کے لئے کتنے کارپرداز چاہئیں، سیاسی ضرورت کے لئے اور سماجی کاموں کے لئے کتنے افراد چاہئیں، قانونی تقاضوں کے لئے کتنے ماہرین کی ضرورت ہے اسی طرح ہماری دینی اور اخلاقی ضرورت کے لئے کتنے واقف کاروں اور ذمہ داری سنبھالنے والوں کی ضرورت ہے، یہ سب ضرورتیں ہمارے پیش نظر ہونا چاہئیں، مقدار اور تعداد کا اندازہ لگانے میں فرق ہو سکتا ہے، لیکن کسی اہم پہلو کو نظر انداز کر دینا صحیح نہیں قرار دیا جا سکتا۔

لہٰذا ہمارے دینی مدارس جو ابتدائی تعلیم کے مکاتب کی شکل میں ہوں وہ تو اتنی تعداد میں رہنے چاہئیں کہ امت کے تمام بچے ان سے مستفید ہو سکیں اور وہ مدارس جن میں عالم و فاضل بننے کی سطح تک تعلیم کا انتظام ہو وہ اس کی ضرورت کے مطابق قائم کئے جانے اور باقی رکھے جانے ضروری ہیں اس میں امت کے تمام طبقوں اور دانشوروں کو ساتھ دینا اور تعاون کرنا چاہئے یہ امت کے مقام اور کردار کو معیاری بنانے اور اس کو اسکے شایان شان حیثیت تک اٹھانے کے لئے ضروری ہے۔

دینی مدارس

اہمیت، افادیت اور ضرورت

اسلام مخالف طاقتوں نے اسلام کو کمزور اور بے اثر بنانے کے لئے اسلام کی تقویت کے دو پہلوؤں کو اپنی نقصان رساں کوششوں کا زیادہ نشانہ بنایا ہے، ایک اسلامی شریعت کے وہ ضوابط ہیں جو اسلامی معاشرت کو صالح اور پاکباز رکھنے سے متعلق ہیں، جن میں مرد وعورت دونوں کے معاملات آتے ہیں اور انسانی معاشرت میں درستگی قائم رکھنے کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو ضوابط مقرر کئے گئے ہیں، اور جو اجتماعی معاملات وتعلقات نیز مالی معاملات سے تعلق رکھتے ہیں، اور فقہی قوانین کے تحت آتے ہیں، ان پر اعتراضات کا طریقہ اختیار کیا جاتا ہے۔

دوسرا پہلو کلام الٰہی قرآن مجید سے مسلمانوں کا جو تعلق ہے کہ اس کے ذریعہ مسلمان کے دل کو روحانیت اور اپنے پروردگار کے ساتھ بندگی کے تعلق کو مدد ملتی ہے، بلکہ وہ ایک ایسا منبع ومرکز ہے کہ اس سے مسلمان جتنا بندھا رہتا ہے، اتنا ہی اس میں جذبۂ دینی اور اخلاقی درستگی کی کیفیت پیدا ہوتی ہے، اس پر حملے کئے جارہے ہیں، لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے کہ علوم دینیہ کی خدمت کرنے والے لوگ ان دونوں پہلوؤں کے سلسلہ میں ضروری صلاحیت پیدا کریں، اور اس طرف

سے آنے والے خطرات کے مقابلہ کے لئے اپنے طالبان علم کو تیار کریں۔

مغرب کا استعماری ذہن اسلام کو اپنا اصل حریف سمجھتا تھا، اور اب بھی یہی سمجھ رہا ہے، بلکہ مغربی ملکوں کے اصحاب اقتدار نے یہ تک اظہار کر دیا ہے کہ کمیونسٹ روس کے بعد ہمارا اصل حریف اسلام ہے، لہذا ان کو برابر یہ فکر دامنگیر ہے کہ اسلام کی مذہبی خصوصیت کی حفاظت کے یہ ادارے جو مسلمانوں میں اسلامی خصوصیات کے تحفظ کا کام کر رہے ہیں، کسی طرح ختم کر دئے جائیں، خواہ طاقت اور سیاسی ڈپلومیسی کے ذریعہ، یا کچھ فرضی الزامات لگا کر ان کی حیثیت کو بے وقعت بلکہ خطرناک قرار دے کر، اس کے لئے مختلف اصطلاحات استعمال کرنے کا طریقہ اختیار کیا گیا، اور تقریباً ہر ملک میں یہ کوشش کی جارہی ہے کہ دینی تحفظ کے یہ ادارے ختم ہو جائیں، اور دنیا میں من مانی زندگی کی فضا عام ہو جائے، اور عملاً دنیا میں یہ دیکھا بھی گیا کہ جن ملکوں میں دینی ادارے ختم کر دئے گئے، وہاں اسلامیت بھی ختم ہو گئی۔

ترکستان میں میں نے خود دیکھا کہ جہاں کے سابقہ عہد کے علماء کی تعداد اور کام ایسا زبردست رہ چکا ہے کہ دنیا کے مختلف حصوں میں ان کی تصنیف کردہ کتابیں اس وقت بھی پڑھائی جارہی ہیں، اور ان سے اسلامی تعلیمات اور احکام کے تحفظ کا کام لیا جارہا ہے، روسی عہد میں مسلمانوں کے دینی مدرسوں کے ختم کر دینے کے بعد صرف دو نسلیں گزرنے پر یہ حال ہو گیا تھا کہ بہت سے لوگ نماز روزہ تک کا مطلب سمجھنے سے محروم ہو گئے تھے، حتی کہ اسلام میں عبادت کے لفظ کا جو مطلب ہے اس تک سے ناواقف ہو گئے تھے، اسلامی عقیدہ سے اور اس کے احکام سے واقف ہونا تو بہت دور کی بات ہے، وہ معمولی دینی باتوں سے بھی واقفیت نہ رکھ سکے تھے، سوائے ان بعض محدود علاقوں کے جہاں خفیہ دینی تعلیم دی جاتی رہی، ان کے علاوہ بقیہ عام علاقوں میں دین سے بالکل ناواقفیت ہو گئی تھی، اگرچہ وہ اس کے باوجود اپنے کو مسلمان کہتے اور سمجھتے

رہے، اسلام سے ان کا رشتہ صرف یہی رہ گیا تھا کہ وہ اپنے کو مسلمان اور مسلمان نسل کا جانتے تھے، ان کے یہاں اسلام کی باتیں بتانے والے نہیں رہے تھے، اب وہاں آزادی ملنے پر فرق شروع ہوا ہے۔

آدمی کی فطرت ہے کہ جو سنتا ہے اور دیکھتا ہے، اسی کو اختیار کرتا ہے، اور جس بات سے ناواقف ہے اس سے وہ محروم رہتا ہے، ضرورت ہے کہ ان مدارس کی اہمیت کو سمجھا جائے اور ان کو بڑھایا جائے اور پھیلایا جائے، کم از کم اس کے ابتدائی مرحلہ کو جتنا عام کیا جاسکے عام کیا جائے، اور جہاں جہاں دین سے ناواقفیت کے حالات ہیں وہاں کی فکر اور زیادہ کی جائے، نہ کہ ان کو بے ضرورت بتا کر ان کے معاملہ میں مخالفانہ روش اختیار کی جائے۔ ہماری مذہبی علوم کی یہ درسگاہیں ہماری ملت کے فرزندوں کو اسلام کی ان تعلیمات سے بہرہ ور کرتی ہیں جن سے اس امت مسلمہ کی مسلمہ ہونے کی صفت برقرار رہے، اس لئے کہ اسلامی تعلیمات کے لحاظ سے اس دنیا کے ساتھ توحید و رسالت و آخرت کا عقیدہ قطعی اور لازمی ہے، اس پر یقین اور اس کے مطابق عمل کے بغیر دین اسلام کا بقا نہیں۔

جدید تعلیم کے لادینی سانچے سے گذرے ہوئے بعض دانشور حضرات ہمارے ان دینی مدارس کو ملت کے لئے غیر ضروری سمجھتے ہیں، ان کے نزدیک دینی تعلیم کی ایسی اہمیت نہیں کہ اس کے لئے علیحدہ سے توجہ کی جائے، کیونکہ دین ان کے نزدیک صرف چند معمولی باتوں تک محدود ہے، اور یہ باتیں بلا خاص نظم و انتظام کے خود بخود معلوم ہوسکتی ہیں، ان کا یہ خیال نہایت سطحی خیال ہے، مسلمانوں کی زندگی میں دین اپنی پوری اہمیت رکھتا ہے، اور زندگی میں پوری وسعت بھی رکھتا ہے، اس بات کو وہ حضرات نہیں سمجھتے جن کے ذہن کی تشکیل خالص مغربی نظام تعلیم میں ہوئی ہے، وہ مغرب کے لادینی نقطۂ نظر سے ہی سوچتے ہیں، اور کہتے

ہیں کہ دین کی تعلیم کے لئے اتنے باقاعدہ انتظام کی کوئی ضرورت نہیں، حالانکہ اگر وہ دین کو زندگی میں وسیع مقام نہ دیتے ہوئے اس کو مسلمان کی زندگی کا صرف ایک پہلو ہی مان لیں تو بھی یہ ماننا پڑے گا کہ جس طرح انسانی زندگی کو میڈیکل کالجوں کی ضرورت ہے تاکہ لوگوں کی زندگی کی صحت کے تحفظ کی اہم ضرورت پوری ہوتی رہے، اور جس طرح انجینیرنگ کالجوں کی ضرورت ہے کہ ان سے زندگی کے ان پہلوؤں کی ضرورت پوری کرنے والے اشخاص پیدا ہوں، اور ان کی ضرورت پوری ہوسکے، اور جس طرح لا کالجوں کی ضرورت ہے کہ حکومت وقت کے قوانین سے واقفیت رکھنے والے ماہرین پیدا ہوں، اور قانونی تحفظ کا انتظام ہو، اسی طرح مذہب کو مسلمانوں کی زندگی کا اگر ایک پہلو ہی تسلیم کرلیا جائے تو بھی ان کو ہمارے ان دینی مدارس کی اہمیت کو ماننا پڑے گا کہ اس ضرورت کے انتظام کے لئے ان کے مدارس کی ضروت ہے، حالانکہ اسلام میں مذہب زندگی کا صرف ایک پہلو ہی نہیں، بلکہ زندگی کے تمام پہلوؤں پر احکام وتعلیمات رکھتا ہے، جن کے جانے اور ان پر عمل کئے بغیر ہم زندگی کو اپنے پروردگار کے حکم کے مطابق نہیں بنا سکتے۔

آج سے ستر اسّی سال قبل ڈاکٹر محمد اقبال جیسے مغرب ومشرق کے احوال سے واقف اور دونوں کے نظامہائے حیات کی خصوصیات کا تجربہ رکھنے والے شخص نے بھی دینی مدرسوں کی اہمیت بتائی ہے، اور صاف اور مؤثر انداز میں ان کی قدر و قیمت ظاہر کی ہے، وہ کہتے ہیں:

> ''ان مکتبوں اور مدرسوں کو اسی حالت میں رہنے دو، غریب مسلمانوں کے بچوں کو ان ہی مدرسوں میں پڑھنے دو، کیونکہ اگر یہ ملا اور درویش نہ رہے تو جانتے ہو کیا ہوگا؟ اب جو کچھ ہوگا، میں اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ آیا ہوں۔

اگر ہندوستان کے مسلمان ان مدرسوں کے اثر سے محروم ہوگئے تو بالکل اسی طرح، جس طرح اندلس میں مسلمانوں کی آٹھ سو برس حکومت کے باوجود آج غرناطہ اور قرطبہ کے کھنڈر اور الحمراء اور باب الاخوتین کے نشانات کے سوا اسلام کے پیرووں اور اسلامی تہذیب کے اثرات کا کوئی نقش نہیں ملتا، ہندوستان میں بھی آگرہ کے تاج محل اور دلّی کے لال قلعہ کے سوا مسلمانوں کی آٹھ سو سالہ حکومت اور ان کی تہذیب کا کوئی نشان نہیں ملے گا۔"

مسلمانوں کے لئے یہ بات قطعی قابل قبول نہیں ہوسکتی کہ ان کی زندگی مذہب سے بے تعلق کردی جائے جس طرح یورپ و امریکہ میں اور ان کے ماننے والوں میں کردیا گیا ہے، اور انسان کو صرف مادی مصلحت کے اندر محدود کردیا جائے، اس کا تجربہ خود مغرب میں اخلاقی و انسانی احساسات و جذبات میں خود غرضانہ اور زندگی کے ہر معاملہ میں خالص مادی نقطۂ نظر کے پھیل جانے میں دیکھا جاسکتا ہے، جس کے خراب نتائج خود وہاں بھی محسوس کئے جانے لگے ہیں، اور ساری دنیا بھی ان کے اثرات کو دیکھ رہی ہے، اور پریشان ہے۔

ہماری مذہبی تعلیم کے یہ ادارے جن کو ممتاز علماء دین اور دین وملت کی صحیح فکر رکھنے والے مسلم دانشوروں نے قائم کیا، اور چلا رہے ہیں، اور ان سے مذہب اسلام کی حفاظت انجام پارہی ہے، ان کو مسلمانوں کے بدخواہوں کی طرف سے بار بار چیلنج کیا جارہا ہے، اگر ہم اس چیلنج کے خطرہ کو نہیں سمجھ سکیں گے تو ہم بحیثیت مسلمان کے ختم ہوجائیں گے، اور مغربی قوموں کی صفوں میں ایک ذیلی قوم بن کر رہ جائیں گے، اس لئے ضرورت ہے کہ ہماری ان درسگاہوں کو جو

مسلمانوں کی زندگیوں میں دین سے واقفیت پیدا کرنے اور اس سے اپنی وابستگی کو قائم رکھنے کے لئے پاور ہاؤس کی حیثیت سے کام کر رہی ہیں، اہمیت کی نظر سے دیکھا جائے۔

مسلمانوں کے لئے موجودہ دور مختلف قسم کی اہمیتوں اور تقاضوں کا دور بن گیا ہے، اس وقت عالمی پیمانہ پر اس امت اسلامیہ کو بے اثر بلکہ بے نام و نشان کر دینے کی کوشش ہو رہی ہے، جگہ جگہ ان کے بقا اور دین کے ساتھ ان کے تعلق کو ختم کر دینے کی سازشیں چل رہی ہیں، کہیں علمی و فکری میدان میں، کہیں تمدنی و تاریخی میدان میں، کہیں سیاسی و سماجی میدان میں، ایسے ایسے فتنے کھڑے کئے جا رہے ہیں کہ اگر ان کے مقابلہ کے لئے ممتاز اہل علم و اعلیٰ صلاحیت کے علماء و فضلاء تیار کرنے کا کام نہ کیا گیا تو اس امت کے وجود کو خطرہ پیش آ سکتا ہے۔

جدید نظام تعلیم میں اصلاح کی ضرورت

دنیا کے مشرقی علاقوں میں جہاں خاص طور پر مسلمانوں کی بڑی آبادیاں اور حکومتیں رہی ہیں، گذشتہ دو تین صدیوں کے مغرب کے استعماری غلبہ واقتدار نے مسلمانوں کو سیاسی اور اقتصادی میدانوں میں جو نقصان پہونچایا اس کی تلخی اور اس سے جو نقصان ان کے سیاسی اور اقتصادی میدان میں ہوا، وہ کسی سے مخفی نہیں ہے، لیکن اس غلبہ واقتدار کے ذریعہ مسلمانوں کے مذہبی عقیدہ اور ان کے صالح فکر ورجحان کو مغرب کے استعماری غلبہ نے جو نقصان پہونچایا وہ دیگر نقصانات سے کم نہیں ہے، مسلمانوں کا تعلیمی نظام جو ان کے مذہبی اور ثقافتی قدروں کو تقویت پہونچاتا تھا، اس کو مغربی اقتدار نے اس کے بالمقابل اپنی مصلحتوں اور مغربی قدروں پر مشتمل تعلیمی نظام کے ذریعہ مغلوب کرنے کی پوری کوشش کی، اور اپنے مغربی تعلیمی نظام سے ایسے افراد تیار کرنے شروع کئے جو مسلمانوں کے ملی رجحانات اور مذہبی تعلیمات کے برخلاف مغربی رجحانات اور تصورات کے حامی بلکہ وکیل ہوں، مغرب کے یہ رجحانات اور تصورات زندگی، آخرت کے عقیدہ اور تصور کو بالکلیہ نظر انداز کر دینے اور زندگی کا سارا نفع وضرر

صرف اسی دنیا کی زندگی میں محدود رکھنے کا حامل بنتے ہیں، حالانکہ ہمارا اسلامی تصور زندگی صرف اس دنیا کے نفع وضرر پر منحصر نہیں، وہ آخرت کے عقیدہ اور زندگی کے اعمال میں آخرت کی خیر وعافیت طلب کرنے کا بھی حامل ہے، وہ دنیا کئے جانے والے اعمال پر محاسبہ کئے جانے اور اس محاسبہ کے لئے ضروری فکرمندی اور احتیاط کے اختیار کرنے کی ضرورت کا حامل ہے، اس طرح دونوں تصور یعنی زندگی کا مغربی تصور اور اس کے مقابلہ میں اسلامی تصور ایک دوسرے کے برخلاف ہوجاتے ہیں، زندگی کے یہ دونوں ایک دوسرے سے مختلف تصور ایک جگہ جمع نہیں ہوسکتے، مغربی تصور صرف دنیاوی نفع وضرر پر مشتمل ہے، جو کہ صرف ایک طرفہ ہے، لیکن اسلام جو تصور دیتا ہے وہ دنیا اور آخرت دونوں کو جمع کرنے کا تصور ہے، اس میں آخرت کی فکر کو زیادہ اہمیت حاصل ہے، کیونکہ آخرت کی زندگی انتہائی طویل بلکہ نہ ختم ہونے والی ہے، اس کے مقابلہ میں دنیاوی زندگی کم مدت کی ہے، اسلام نے اس کی درستگی اور اس کے فائدہ کے لئے بھی فکر کرنے کی اجازت دی ہے، بلکہ آخرت کی فکر کے ساتھ ساتھ دنیا کی فکر کو بھی حسب ضرورت اور فطرت کے جائز تقاضوں کے تحت ضروری قرار دیا ہے۔

مغربی استعمار کے عقلاء نے جو نظام تعلیم ہر جگہ عائد کیا ہے، وہ اس کے یک طرفہ صرف دنیاوی تصور کا حامل ہے، یہ نصاب جب جاری ہوا تو اس نے ایک صدی کے عرصہ میں مسلمانوں کی نئی نسل کو بہت متاثر کیا، اور ان کے ذہنوں کی تشکیل خاصی حد تک اپنے فکر ورجحان کے مطابق انجام دی، اور چونکہ عوام الناس اپنے سطحی ذہن کے سبب دنیاوی کامیابی کو صرف حکومت کے سرپرستی والے نظام ہی میں منحصر سمجھتے ہیں، اس لئے ملک کے عامۃ الناس اور ایسے دانشور جن کے ذہن میں آخرت کا تصور مضبوط نہیں ہے صرف اسی کی طرف ہوئے، اور

اس میں دینی لحاظ سے کچھ جو منفی اثرات ہوتے ہیں مسلمانوں کی مذہبی تعلیمات اور عقائد واقدار کو جو نقصان پہونچتا ہے اس کو دھیان میں نہیں لاتے۔

رائج تعلیمی نظام کا یہی وہ پہلو ہے جس کو دھیان میں رکھتے ہوئے غیرت اسلامی کے حامل مسلمانوں نے مذہبی تعلیمات کے لئے ایک خطرہ محسوس کیا، اور اسی کے تدارک کے لئے اس سے علیحدہ اور اسلام کے دینی تقاضہ کے لحاظ سے اپنا مخصوص نظام تعلیم جاری کیا، اور اس کے ذریعہ دینی خطرہ کے تدارک کی کوشش کی، اور اپنے مخصوص مدرسے قائم کئے، جن میں اسلامی تعلیمات کے بنیادی مضامین مؤثر اور تفصیلی انداز میں رکھے، تاکہ ان کے ذریعہ ایسے افراد تیار ہوں سکیں جو مغرب کے مادی اور استعماری فکر کے اثرات کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت حاصل کرسکیں، اور امت اسلامیہ کے دینی تشخص اور زندگی کے صالح تصور کو جس حد تک ہو سکے بچانے کا کام کرسکیں، اور اس سے ایسے علماء تیار ہوں جو حالات اور زمانہ کے بدلتے ہوئے انداز کو سامنے رکھتے ہوئے امت مسلمہ کی مذہبی خصوصیت کی بقا کے لئے ضروری اور مناسب حد تک جدو جہد کریں، تاکہ مسلم عوام اسلام کی تعلیمات سے محروم نہ ہوں، بلکہ ان کو ایسی رہنمائی ملے جس سے وہ زندگی کو اسلامی اقدار کے مطابق استوار کرسکیں، چنانچہ ملک کے علماے دین نے ایسے دینی مدارس قائم کئے جو مادی وسائل کی سخت کمی کے باوجود اہل اسلام کو ان کے دینی تقاضہ سے واقف کراتے اور علوم دینیہ اور اس کی ضرورت کے مطابق ان مدارس کو چلاتے رہے، مسلمانوں کا مذہب سے جو تعلق ہے اس کی بنا پر عوام کی طرف سے علماء کی کوششوں کو عام طور سے سراہا گیا اور پسند کیا گیا، اور ان کے برعکس مغربی نظام کے پروردہ لوگوں نے علماء سے اور ان کے تعلیمی نظام سے اختلاف کیا، اور اس کو غیر ضروری کام قرار دیا۔

بہر حال ایک طرف مغربی تعلیم نظام نے دین سے بے توجہی اور زندگی کی آزادی کا ذہن بنایا، دوسری طرف اس کے مقابلہ میں علمائے دین سے جو ہوسکا وہ انہوں نے اپنے دینی مدرسوں کے ذریعہ انجام دیا، جس کو مغربی نظام تعلیم کے پروردہ حضرات فرسودہ نظام تعلیم ہونے کا طعنہ دیتے رہے، اور زندگی کی دنیاوی ترقی اور بہتری کے عنوان سے اپنے مغربی نظام تعلیم کی برتری ثابت کرتے رہے۔

اس سلسلہ میں یہ بات سمجھنے کی ہے کہ مغربی فکر کے حامل نظام تعلیم نے دینی تعلیمات اور اقدار کے لئے جو خطرہ پیدا کیا اس کے مقابلہ کے لئے مذہبی علوم میں پختگی اور وسعت رکھنے والوں کی ایک تعداد کا ہونا ضروری تھا، جو مسلمانوں کے عقیدہ و مذہب اور اس پر آنے والے خطرہ کا مقابلہ کرسکیں، اس کام کے لئے اسی کے مطابق علوم میں مہارت کے لئے ان کو بھی یکسوئی کے ساتھ حاصل کرنا ضروری تھا، اس لئے اس کے حاصل کرنے والوں کو اس کے ساتھ بھی اپنے کو مخصوص کرنا پڑا، اسلامی تعلیمات کے بقا کے لئے ہمارے یہ دینی مدارس ایک ضروری تعداد میں قائم کئے جانا لازمی تھے، البتہ اجتماعی زندگی کے جائز تقاضوں کے تعلق سے جو دیگر موضوعات ہیں جن میں زندگی کی دنیاوی ضروریات و مسائل مثلاً تاریخ، جغرافیہ، ریاضی اور لسانیات اور زندگی کے نظم و انتظام کے معاملات تو ہمارے دینی مدارس نے ان کو بالکلیہ نظر انداز نہیں کیا، بلکہ ان سے بھی بقدر ضرورت واقفیت پیدا کرنے کے لئے مذہبی علوم کی تعلیم کے ساتھ اضافی طور پر ذرائع کی حیثیت سے داخل نصاب کیا، انہیں اپنے نصاب میں ان کے لئے جو جگہ نکالی جاسکتی ہے اس کو بھی نکالنے کی کوشش کی ہے، لیکن یہ بات بھی سمجھنے کی ہے کہ ہمارے دینی مدارس کا جو دینی نصاب ہے وہ اتنی مقدار

میں ہے کہ اس کے ساتھ ہر طرح کے علوم زیادہ مقدار میں شامل نہیں کئے جاسکتے، لیکن ان میں سے جو واقعی ضروری ہیں ان کا انتخاب ان کی ضروری مقدار میں داخل کرنے کی فکر کی گئی، البتہ ان کا انتخاب ہمارے ان علماء ہی کے کرنے کا ہے جو اپنے وسیع دینی علوم کے ساتھ وقت اور زندگی کی لازمی ضرورت کے علوم سے واقفیت رکھتے ہیں۔

اس سلسلہ میں ندوۃ العلماء کی انجمن نے جو آج سے سوا سو سال پہلے قائم کی گئی تھی قدم اٹھایا تھا، اس کی طرف سے اولاً اس بات کی دعوت دی گئی تھی کہ علوم دینیہ کی اقسام اور مقدار نصاب کم کئے بغیر وقت اور تقاضائے حیات سے تعلق رکھنے والے مضامین کو بھی نصاب میں جگہ دی جائے، پھر دار العلوم قائم کر کے اس کا تجربہ شروع کیا تھا، جس کو شروع میں ہمارے مذہبی تعلیم کے دیگر مدارس اختیار کرنے میں دشواری محسوس کرتے ہوئے عمل میں نہیں لائے، اس کی وجہ سے بڑی حد تک ملک میں قائم نظام تعلیم دو علیحدہ علیحدہ شعبوں میں منقسم رہتے ہوئے چلتا رہا، ایک خالص دینی دوسرا خالص دنیاوی، اس کی وجہ سے امت کے تعلیم یافتہ حضرات دو علیحدہ علیحدہ راستوں میں چلتے رہے اور ایک دوسرے سے بعد رکھتے رہے، لیکن اب کچھ عرصہ اکثر دینی مدارس تعلیم کے دونوں پہلوؤں کو جمع کرنے کی کرنے لگے ہیں، اور یہ ماننے لگے ہیں کہ مختلف الجہت طبقوں کے درمیان تعاون اور قربت کی ضرورت ہے، اور یہ ضرورت ہمارے دینی مدارس کے ذریعہ پوری ہوسکتی ہے، اس کے لئے ہمارے ان مدارس اور عصری تعلیم کی درسگاہوں دونوں کو اپنا طریقہ فکر بدلنا ہوگا، محض مدارس دینیہ میں عیب نکالنا اور ان کو تبدیلی کا مشورہ دینا اور اپنے نظام کی کمزوریوں کو نظر انداز کرنا صحیح نہیں قرار دیا جاسکتا، مسلمانوں کی عصری درسگاہوں کو بھی اسلامی

تعلیمات سے وابستہ رکھنے کے لئے دین کے ضروری مضامین کو اپنے نظام تعلیم میں شامل کرنا ہوگا، تاکہ ان درسگاہوں سے تعلیم حاصل کرنے والے بھی اسلام کے عقیدہ وخیال سے وابستہ رہیں، اور مغربی فکروخیال میں گم ہوکر یہ کہ "درکان نمک نمک شد" نہ ہوجائیں، اسی کے ساتھ یہ ضرورت بھی ہے کہ ہمارے دینی مدارس اپنے نصاب میں سماجی اور بشری ضرورتوں سے واقف کرانے والے مضامین بھی شامل کریں، نیز ذرائع کی حد تک تعلیم کے نظم وانتظام کے جدید تجربوں سے حاصل طریقوں سے بھی فائدہ اٹھائیں، کہ " الحکمة ضالة المؤمن فأین وجدها فهو أحق بها"۔

لیکن یہ اس طرح ہو کہ ہمارے دینی مدارس میں پڑھائے جانے والے مذہبی علوم میں وسعت وپختگی میں کمی نہ آئے، تاکہ دینی اور اخلاقی ضرورتوں کے لئے امت کو برابر اچھے رہبر ملتے رہیں، بہرحال نصاب میں تغیر کی دعوت کے تعلق سے دونوں باتوں کی طرف توجہ کی ضرورت ہے، بلکہ شائد یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ہمارے دینی مدارس کو اپنے نصاب تعلیم میں نئے مضامین داخل کرنے کی دعوت اتنی ضروری نہیں جتنی کہ جدید تعلیمی نظام میں اسلامی تعلیمات کو داخل کرنے کی ضرورت ہے۔

انسانوں کی ذہنی اور عملی صلاحیتوں کو پروان چڑھانے میں تعلیم کا عمل اہم نتائج پیدا کرتا ہے، اور تعلیم کا عمل اساتذہ، منتظمین اور علماء کی کارکردگی کے علاوہ اس عمل کے لئے نصاب ونظام کی حسب تقاضائے ضرورت تشکیل دینا بنیادی حیثیت رکھتا ہے، اور یہ قوم وملت، مقصد حیات اور مستقبل کے تقاضوں کو سامنے رکھ کر تیار کیا جاتا ہے، چنانچہ اس کو ملت کی ضرورتوں اور اس کی مذہبی اور ثقافتی قدروں کے مطابق ہونا چاہیے، تاکہ اس کے سانچے میں جو افراد ڈھالے

جائیں وہ قوم کی ضرورتوں اور تمناؤں کے مطابق ہوں، مذہب وملت کی اساسی ضرورت کی پابندی کے ساتھ ساتھ نظام ونصاب تعلیم جامد صورت کا نہیں ہوتا، بلکہ اس میں بدلتے حالات کا بھی لحاظ کیا جاتا ہے، اور اس میں دوسروں کے تجربات سے بھی فائدہ اٹھایا جاتا ہے، لیکن یہ تغیر واستفادہ ملت کے عقیدہ ومفاد اور اس کے ثقافتی اور مذہبی تشخص کو قائم رکھتے ہوئے ہوتا ہے۔

مغرب کے مشرق پر تسلط کے وقت سے ہمارے مشرق کو اس دائرہ میں خاصا نقصان اٹھانا پڑا، اور یہ نقصان جاری ہے، یہ اس وقت تک دور نہیں ہوسکتا جب تک ہم اپنی ثقافتی اور مذہبی قدروں کو نظام تعلیم میں نظر انداز کرتے رہیں گے، مغربی نظام تعلیم میں زبان اور سماجی علوم اور انگریزی زبان کا نصاب بنانے والوں اور اس کے مطابق تعلیم دینے والوں کا جیسا ذہن وخیال ہوتا ہے، ان کی درسگاہوں میں تعلیم حاصل کرنے والوں پر ویسا ہی اثر پڑتا ہے، اور پڑھنے والوں کی وہی ذہنی تشکیل کرتا ہے، اس لئے ہمارے جدید نصاب کو بھی اسلامی اقدار کے مطابق ڈھالنا ہوگا تاکہ اس کے پڑھنے والے اپنے اسلامی ذہن کو برقرار رکھ سکیں، اس کے بالمقابل ہمارا مذہبی نظام تعلیم امت مسلمہ کے دینی اور ثقافتی مزاج کی پوری طرح حفاظت کرنے والا نصاب ہے، اس کے بالمقابل مغرب کا دیا ہوا نصاب تعلیم طبعی علوم کے دائرہ میں تو منفی اثر نہیں ڈالتا ہے، اور اس سے اسلامی اقدار کو خطرہ نہیں ہے، وہ ہمت افزائی کے لائق ہے، لیکن اس کا لسانیات، سماجی اور انسانی علوم کا حصہ مغرب کا مادی اور ملحدانہ مزاج دینے والا ہے، اور وہ ہمارے ملی مقاصد اور اقدار کے برعکس ہے۔

یہی وہ اصل وجہ ہے جو ہمارے دینی مدارس کے لئے جدید نصاب و نظام تعلیم سے بے تکلف استفادہ کرنے سے مانع بنتی ہے، اور جب تک دونوں

نظام تعلیم اپنی اپنی جگہ مناسب اصلاح واضافہ کی طرف توجہ نہ کریں گے دونوں میں ہم آہنگی پیدا نہیں ہو سکے گی، لہذا جدید نصاب تعلیم کو اپنی اصلاح کی بھی فکر کرنا ہوگی، اور ایسا نہ کرنے پر ملت اسلامیہ کو اپنے تشخص اور ثقافت و مذہبی قدروں سے دست بردار ہونا پڑے گا، لہذا اصلاح نصاب کی ضرورت سیکولر اداروں کے لئے بھی ہے، تاکہ مسلمانوں کی نئی نسل کا مذہبی تشخص ختم نہ ہو اور وہ اپنے مذہب سے بالکل ناواقف نہ رہیں۔

مسلمانوں کی تعلیم میں ترقی کی ضرورت

اور قابلِ توجہ پہلو

تعلیم متمدن انسان کی ایسی ہی ضرورت ہے جیسے جسمانی صحت کے لئے کھانا۔ موجودہ عہد میں مغربی قوموں کی تعلیم کے میدان میں فکرمندی ترقی اور نظم وانتظام پھر اس کے دوررس نتائج نکلنا سب کے سامنے ہے، ان کو دیکھ کر ہمارے پسماندہ مشرقی ممالک میں بھی اپنے لئے تعلیم کے بہتر نظم وانتظام کی ضرورت کا احساس بڑھا اور اس کے نتیجہ میں عصری مضامین کی درسگاہیں قائم کی گئیں اور کی جارہی ہیں، لیکن یہ عمل بڑے وسائل اور حسن انتظام اور فکرمندی کا طالب ہے، جس کی مسلمانوں میں کمی بھی ہے اور اس کے لئے توجہ بھی ابھی کم ہے، بہرحال اس کے جو وسائل اور تقاضے اور جو دشواریاں ہیں وہ مسلم دانشوروں کی خصوصی توجہ کی محتاج ہیں اور ان کی مخلصانہ فکر پر بہتر نتائج کے حصول کا انحصار ہے۔

مسلمانوں کی قائم کردہ درسگاہوں میں ایک تو وہ درسگاہیں ہیں، جنھوں نے اپنے کو علوم دینیہ کی حفاظت اور ترویج کے ساتھ وابستہ کرلیا ہے، وہ عوامی چندوں سے اپنی مالی ضرورت کو پورا کرتی ہیں، اور اس میں اسلامی شعور

رکھنے والے اہل ثروت اپنے اپنے جذبۂ دینی کے مطابق حصہ لیتے ہیں، یہ درسگاہیں امت کو علمائے دین اور مذہبی رہبر و مصلح فراہم کرتی ہیں جو امت اسلامیہ میں دین کی حفاظت اور اس کی زندگی کو دینی ضوابط کا پابند بنانے کی کوشش کا اپنا فریضہ انجام دیتے ہیں۔

ان درس گاہوں کے متعدد اہم مسائل میں ایک اہم مسئلہ حکومت کی طرف سے ان کو تسلیم کرنے کا ہوتا ہے پھر تسلیم کئے جانے کے بعد ان کو ملت کی خصوصیات کو باقی رکھتے ہوئے چلانے کا اور آزادانہ عمل کرنے کا مسئلہ ہوتا ہے۔ دوسرے ان کے مالی تقاضوں کو پورا کرنے کا مسئلہ طالب توجہ بن جاتا ہے کیونکہ ان کے شعبوں کی وسعت اور ان کے لئے وسائل کی ضرورت، زیادہ مصارف کی متقاضی ہوتی ہے جو حکومت وقت کی مدد یا فیاض اور سخی اہل ثروت کے تعاون ہی سے پورے کئے جاسکتے ہیں، پھر ایسی تعلیم گاہوں کی ضرورت مسلمانوں کی تعداد کے لحاظ سے جگہ جگہ قائم کئے جانے کی ہوتی ہے کیونکہ مسلمانوں کی تعداد ملک میں معتد بہ ہے اور ملک کے مختلف علاقوں میں پھیل رہی ہے، ان کی تعلیم کی ضرورت اور ان کی ضروری تعداد کو سامنے رکھتے ہوئے ان درس گاہوں کا قائم کرنا ایک ایسا عمل ہے جو حکومت کی مدد کے ساتھ قوم کے فراخدلانہ تعاون ہی سے ہوسکتا ہے وہ تنہا حکومت کی مدد کی صورت میں اپنی ملت کی خصوصیت کی مکمل بقا کے ساتھ نہیں ہوسکتا۔ اپنی ملی خصوصیت کی حفاظت کے ساتھ تعلیم چلانے کے لئے پرائیویٹ اداروں کا نظام ضروری ہوتا ہے اور مسلمانوں کے لئے ایک ایسے ملک میں جہاں وہ اقلیت میں ہیں یہ مسئلہ زیادہ اہمیت کا بن جاتا ہے، کیونکہ حکومت کے سیکولر ہونے اور مسلمانوں کے اقلیت میں ہونے کی وجہ سے حکومت کا تعاون مسلمانوں کے ملی خصوصیات کے اداروں کو کم ہی حاصل ہوسکتا ہے، اس

صورت میں خود اقلیت کو باہمت بننے کی ضرورت ہوتی ہے اور عزم و حوصلہ کے ساتھ اپنی ضرورت کے لئے خود اپنے پیروں پر کھڑا ہونا لازم ہوتا ہے اس میں اگر حکومت سے تعاون ملتا ہو تو اس سے فائدہ اٹھانا چاہئے لیکن اس احتیاط کے ساتھ کہ وہ تعلیم گاہ کے مقصد اور اس کی ملی خصوصیت کو متاثر نہ کرے بلکہ مسلمانوں کی علمی و فکری تشکیل کے ساتھ ان کی ملی خصوصیات کے پیدا کرنے کا ذریعہ ثابت ہو۔

ہندوستان میں مسلمانوں کے زیر انتظام عصری تعلیم کے جو ادارے ہیں ملک کے سیکولر ہونے کی بنا پر اقلیتوں کو جو حقوق دیئے گئے ہیں ان کی بنیاد پر یہ ادارے مسلم انتظام میں اور اپنی مرضی کے مطابق بڑی حد تک چلائے جاسکتے ہیں، اسی کے ساتھ ساتھ اگر حکومت سے مدد بھی ملتی یا مل سکتی ہے تو یہ ایک بڑی سہولت ہے جس سے مسلمانوں کو اپنے ملی تشخص کے ساتھ اپنے تعلیمی ادارے چلانے کا موقع ملتا ہے، لیکن اس کا انحصار مسلم انتظامیہ کے ارادہ اور صلاحیت پر ہے، کیونکہ ادارہ کی پالیسی کا تعین اور پھر اس پالیسی کا تحفظ نیز اسکے کاموں میں چستی اور مقصد کے مطابق کارکردگی، یہ سب ادارہ کی انتظامیہ کی توجہ و فکر مندی پر منحصر ہوتا ہے، اس طور پر پہلی ذمہ داری انتظامیہ پر آتی ہے، لیکن انتظامیہ کی توجہ و فکر مندی کا اصل فائدہ اس وقت ہوتا ہے جب انتظامیہ کے حضرات تعلیمی اداروں کی مشکلات اور ان کی ضرورتوں کا پورا علم رکھتے ہوں اور اپنی ملت کی علمی ضرورت اور ملی تشخص کی اہمیت سے پوری طرح آگاہ ہوں تاکہ اس کے مطابق وہ توجہ اور فکر مندی عمل میں لائیں اور وہ اس امر کا جواب دے سکتے ہوں کہ ان کے ملک بلکہ شہر میں دیگر متعدد اداروں کے ہوتے ہوئے مزید اس ادارہ کی ضرورت کیا ہے۔ آیا صرف تعداد میں اضافہ کرنے کے لئے یا اپنے ایک جدا

رنگ وخصوصیت کے ساتھ ادارہ کو چلانے کے لئے، اور اگر جدا رنگ وخصوصیت کا ادارہ قائم کرنا ہے تو یہ کیوں اور کس مقصد سے قائم کرنا ہے۔؟؟؟

مسلمان انتظامیہ اس سیکولر ملک میں جب کوئی ادارہ قائم کرتی یا چلاتی ہے تو ظاہر ہے کہ وہ اداروں کی تعداد میں صرف مزید اضافہ کے لئے نہیں ہوتا، بلکہ وہ اپنی ملت کے مقصدِ حیات یا اپنے کلچر یا اپنی زبان کے تحفظ کے لئے قائم کرتی ہے اور علم وفن کے میدان میں اپنی امت کے فرزندوں کو نمایاں مقام تک پہنچانے کے لئے یہ قدم اٹھاتی ہے، مسلمان انتظامیہ کو اولا یہ بات سمجھنا ضروری ہے، پھر اس کے تقاضوں کے مطابق فکر وتوجہ سے کام لینا ہے۔

لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ مسلمانوں کے اداروں کو جب حکومت سے مدد ملتی ہے تو ان کے نصاب ونظام پر کچھ ضوابط بھی حکومت کی طرف سے عائد کئے جاتے ہیں، جو ادارہ کے مسلمان انتظامیہ کو پورا کرنا ہوتے ہیں، ان ضوابط کے دائرہ سے باہر دیگر متعدد پہلوؤں میں ادارہ کو مسلم انتظامیہ کی مرضی کے مطابق چلانے کا اختیار حاصل ہوتا ہے، ان کو اپنی مرضی کے مطابق عمل کرنے کا یہ اختیار ملک کے سیکولر دستوری رو سے حاصل ہوتا ہے، ان تعلیم گاہوں کا یہی وہ پہلو ہے جس کے رو سے مسلم انتظامیہ کو اپنے ملی ومذہبی تشخص کے ساتھ تعلیمی نظام کا بندوبست کرنے کی سہولت حاصل ہوتی ہے اور مسلمان طلبہ کو اپنی خصوصیات کو برقرار رکھنے اور مضبوط بنانے کا موقع حاصل ہو جاتا ہے، اور یہ بات چونکہ ان تعلیم گاہوں کو مسلم انتظامیہ کے توسط سے حاصل ہوتی ہے اس لئے ادارہ کو مفید طریقہ سے چلانے کی ذمہ داری اصلاً مسلم انتظامیہ پر جاتی ہے، اگر مسلم انتظامیہ اپنے اس حق کو فکر وتوجہ سے استعمال نہ کرے تو پھر مسلم انتظامیہ کے ہونے یا نہ ہونے میں کوئی فرق نہیں رہ جاتا، اور جہاں تک مشکلات کا تعلق ہے تو

اس سیکولر ملک میں مسلم انتظامیہ کے تحت جو ادارے چل رہے ہیں ان کے دو امور زیادہ قابل فکر ہیں، ایک تو یہ کہ انتظامیہ کے افراد میں یک جہتی اور تعلیم کے بڑے مقصد کے لئے اپنی شخصی رائے اور خیال کو آپس میں متحد رکھ کر چلانا کبھی کبھی خاصا مشکل بن جاتا ہے اور انتظامیہ کے ارکان کی رائے کا اختلاف بعض بعض وقت لافانی اختلاف بن جاتا ہے، اس اختلاف کی وجہ سے ادارہ کے بنیادی مصالح کو بڑا ضرر پہنچتا ہے اور ادارہ کمزور ہو کر مکمل کامیابی سے دور ہو جاتا ہے۔

دوسرا قابل ذکر مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ نظام تعلیم میں ملت کے مزاج اور اس کی ملی مصلحت کا لحاظ خاطر خواہ طریقے سے نہیں ہوتا، اس کمی کا اثر یہ ہوتا ہے، کہ نوجوان طلبہ کی تشکیل اسلامی ملت کے عین مقصد و مزاج کے مطابق نہیں ہو پاتی۔

بہر حال مسلم انتظامیہ والے اداروں کی کچھ دشواریاں تو انتظامیہ کی بعض کمزوریوں اور بے توجہیوں سے پیدا ہوتی ہیں اور کچھ کمزوریاں وسائل کی کمی کی بنیاد پر ہوتی ہیں۔ ان میں ایک دشواری جو اہم دشواری بھی ہے ادارہ کی ضرورت کے مطابق مالی فراہمی کا نہ ہونا ہے، وہ پرائیویٹ اور اقلیتی ادارہ ہونے کی وجہ سے حکومت سے اتنی مدد کے حق دار نہیں ہو پاتے جتنی ان کے اپنے مطلوبہ منصوبوں کو بخوبی چلانے کے لئے کافی ہو، چنانچہ اس مسئلہ کے حل کے لئے ان کو لامحالہ اپنی ملت کے اہل ثروت افراد کی طرف دیکھنا پڑتا ہے، اور یہ اہل ثروت افراد مسلمانوں کی ضرورت کی اہمیت کو اس طرح نہیں محسوس کر پاتے جس طرح ایک زندہ اور متحرک قوم کی ضرورتوں کو محسوس کرنا چاہئے، اس کمی کی وجہ سے ادارہ کی ترقی میں رکاوٹ پیدا ہو جاتی ہے، لہذا اس کے لئے ان حضرات کی ہمدردی حاصل کرنے کی طرف توجہ مبذول کرنے کی ضرورت ہے، اس کے لئے ان اداروں کے ذمہ داروں کو اپنی صلاحیتوں اور عملی کوششوں سے ملت کی اس

ضرورت کی طرف جوان اداروں ہی سے پوری ہوسکتی ہے رابطہ بڑھانا چاہئے اوران کے دل ودماغ کواس ضرورت کے پورا کرنے کی طرف مائل کرنا چاہئے، ملت میں الحمدللہ ایسے اصحاب ثروت ہیں جو اس اہم ملی ضرورت کو پورا کر سکتے ہیں، ضرورت ہے کہ ملت کے بااثر افراد میں اس بات کا احساس بڑھے، اور وہ اپنی صلاحیتوں سے پورا پورا کام لیں اوراس فائدہ کو سمجھیں جوان کی توجہ سے مسلم ملت کو پہنچ سکتا ہے۔

دوسرا پہلو جوان اداروں کا قابل توجہ ہے وہ تعلیمی وتدریسی نظام ہے، جس کے ذریعہ اساتذہ کواپنے فرائض منصبی زیادہ سے زیادہ یاددلانا اوراس پران کو عامل بنانا ہے، تاکہ وہ طلبہ کوعلم کے حصول میں یکسو ہوکر مشغول ہونے کی طرف متوجہ کریں اوران میں جذبہ پیدا کریں خاص طور پراس لئے بھی کہ اقلیت کے افرادکوزندگی کی دوڑ کے لئے زیادہ محنت وتوجہ اور کام میں یکسوئی کی ضرورت ہوتی ہے۔

تیسرا پہلونصاب تعلیم کا ہے، جونصاب تعلیم ہماری ان تعلیم گاہوں کو انگریزوں کے زمانے سے ورثہ میں ملا ہے، وہ ابھی تک انگریزوں کے اختیار کردہ مقاصد کے دائرہ سے آزاد نہیں ہوسکا ہے، اس میں جونظام تعلیم اختیار کیا جاتا ہے وہ نوجوان طالب علم کوعموماایک اچھا کلرک یا آفیسر یامادی زندگی کے حصول ہی کی حدتک فائدہ پہونچانے کا کام دیتا ہے، ان نوجوانوں کوملت کی صحیح فکر وثقافت سے وابستہ اور ملت کی رہنمائی کی اصلی صلاحیت کا حامل اور ملت کے ملی تشخص و خصوصیت کا محافظ نہیں بناتا، سوائے چند ایسے افراد کے جواپنے گھروں سے اپنی اعلیٰ قدروں کی تربیت حاصل کرکے ان اداروں میں آتے ہیں وہ تواپنی اخلاقی و ثقافتی خصوصیات کو قائم رکھتے ہیں، اور پھراس سے مستقبل میں ملت کو فائدہ

پہنچاتے ہیں، لیکن یہ تعلیم گاہیں اپنے نصاب سے ایسے اعلیٰ افراد پیدا نہیں کر پاتی ہیں جو علم و عمل میں ممتاز خصوصیات کے حامل ہوں، ان تعلیم گاہوں کے نصاب کا، خاص طور پر وہ حصہ جو زبان و ادب اور سماجی علوم سے تعلق رکھتا ہے ان خصوصیات سے عملاً خالی ہوتا ہے، جن کی ضرورت ایک مسلمان نوجوان کو اپنی ملت کی خصوصیت اور ضرورت کے مطابق اپنی شخصیت کی تشکیل کے لئے ہوتی ہے، اس نقص کی درستگی نصاب تعلیم کو خاص طور پر ادب و زبان اور سماجی اور انسانی علوم کو نئے سرے سے ڈھالنے اور ان کے مطابق کتابیں تیار کرنے کی ضرورت ہے، اور جب تک اس ضرورت کا نصاب تیار نہ ہو سکے اس وقت تک اہل نظر حضرات جاری شدہ نصاب کا مبصرانہ جائزہ لے کر ملت کی قدروں اور عقیدہ سے جوڑ نہ کھانے والی چیزوں کو نظر میں لائیں، اور نوجوان طلبہ کو اس سے واقف کرائیں تا کہ وہ کسی ناآہنگ بات سے بدگمان نہ کئے جا سکیں، اور اس کے ضرر سے بچ سکیں، اس کام کے لئے صاحب بصیرت اور صاحب واقفیت جو صحیح اسلامی شعور سے خالی نہ ہوں ان کی توجہ کی ضرورت ہے۔

ہماری تعلیم گاہوں کو وقت کی رفتار اور علوم کے بڑھتے ہوئے قافلہ پر بھی پوری نظر رکھنے کی ضرورت ہے، علم برابر ترقی اور توسع کی راہ پر چل رہا ہے، اور وہ اس وقت انسان کی ہر طرح کی ترقی کا ذریعہ بن گیا ہے، ضرورت ہے کہ ہمارے ادارے نئی حاصل ہونے والی دریافتوں اور نئے پیدا ہونے والے اور ترقی کرنے والے علوم پر برابر نظر رکھیں تا کہ ہم ان کے سلسلہ میں پیچھے نہ رہ جائیں، اس کے لئے امت میں ایک روح بیدار کرنی ہوگی اور اہل مقدرت افراد کو ان ضرورتوں کو پورا کرنے میں تعاون کرنے کی طرف متوجہ کرنا ہوگا۔

دراصل مسلمان انتظامیہ رکھنے والی تعلیم گاہوں پر ایسے افراد ڈھالنے کی

ذمہ داری عائد ہوتی ہے جن کی موجودہ زمانہ میں قوم کی رہنمائی اعلیٰ سطح سے کرنے کے لئے ضرورت ہے، ان کے سامنے مسلمانوں کا وہ دور تاریخ کے صفحات میں نمایاں ہے جو قرون وسطی میں جب کہ یورپ تاریکی اور جہالت کے دور سے گزر رہا تھا، اور مسلمان مفکر، معلم اور ماہرین علم وتمدن برابر پیدا ہو رہے تھے اور تاریخ میں اپنا مقام بنا رہے تھے جس کا یورپ کے مصنفین ومؤرخین بھی جگہ جگہ اعتراف کرتے ہیں کہ یورپ نے چھ سو سال تک ان مسلمانوں کی تحقیقات وعلمی تفوق سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ترقی کا آغاز کیا، ضرورت ہے کہ ہماری تعلیم گاہیں اور ماہرین تعلیم اپنے اس شاندار ماضی کو خود بھی پیش نظر رکھیں اور نوخیز نسلوں کو بھی اس سے واقف کرائیں تاکہ ان میں حوصلہ بڑھے اور ترقی کی راہیں ان کو معلوم ہوں، کوئی تعجب نہیں کہ وہ اس روشنی میں یورپ کی صرف برابری ہی نہیں بلکہ یورپ سے آگے بڑھ جائیں، ان کو یہ بھی سمجھنا چاہئے کہ یورپ نے اپنی ساری ترقیات کے لئے صرف اپنی جسمانی اور مادی راحت کو مقصود بنایا ہے، اس نے اپنے دل ودماغ کو صرف ظاہری وسطحی مسرتوں کے لئے آزاد وبے مہار بنا رکھا ہے، لیکن مسلمان زندگی کے جائز پہلوؤں کو حاصل کرنے کے ساتھ انسانی قدروں کی حفاظت اور انسانیت نواز اخلاق کی تلقین کو بھی اپنا فریضہ سمجھتا ہے، اور اس کی تعلیم اس کو قرآن مجید اور حدیث شریف سے ملنے والے احکام الٰہی اور سیرت رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے حاصل ہوئی ہے اور اس کے ذریعہ اس کو انسانیت اور دنیا کی بہتر سے بہتر ترقی میں رہبرانہ کردار انجام دینے کی ہدایت ملی ہے، اور اسکے اسلاف نے اس پر عمل بھی کیا ہے، جس کی مثالیں امت کے ماضی کی تاریخ میں خاصی ملتی ہیں۔

مسلمانوں کی نئی نسل کی تربیت کی ضرورت

مسلمانوں کی ثقافت اور اس کے مطابق نئی نسل کو تیار کرنا نہ صرف یہ کہ بہت اہم اور ضروری کام ہے بلکہ وہ متعدد پہلو رکھنے والا اور بڑی فکر وتوجہ کا کام ہے، یہ ماں کی گود سے شروع ہوتا ہے اور جوانی کے بعد تک مختلف النوع طریقوں سے جاری رہتا ہے، اس میں انفرادی طور پر نگہداشت رکھنے، پند ونصیحت کرنے، اثر پذیر ماحول بنانے، تعلیم وذرائع ابلاغ سے کام لینے نیز اخلاقی اثرات ودباؤ استعمال کرنے تک کے طریقے اختیار کرنے پڑتے ہیں، ان تمام تدبیروں اور طریقوں سے اگر صحیح کام لیا جائے اور توجہ کی جائے تو ایسی نسل تیار ہوسکتی ہے جو اپنے مذہب اور اجتماعی اقدار کی پابند اور ان کے تقاضوں کو پورا کرنے والی ہو اور اگر اس سلسلے میں کوتاہی کی جاتی ہے یا کسی مرحلہ میں فکر وتوجہ کی طرف سے غفلت برتی جاتی ہے تو اسی کے بقدر نقص اور عیب پیدا ہوتا ہے۔

اس سلسلہ میں اس بات کی فکر کرنے کی ضرورت ہوتی ہے کہ بچہ ان باتوں سے ہی متاثر ہو جو اخلاق وکردار بنانے والی ہوں اور جو مذہب ومعاشرہ کی قدروں کی حامل ہوں، ماں کی گود اور گھر کے اندر کے ماحول کے بعد مدرسہ کی منزل آتی ہے، مدرسہ میں ایسا نظام تعلیم وتربیت اپنانے کی ضرورت ہوتی ہے جو بچہ

کے ذہن ورجحان کو صحیح رخ پر چلائے، دوسری طرف محلّہ اور معاشرہ کے ماحول کو بھی ایسا بنانا ضروری ہوتا ہے جس میں نوخیز نسل اچھی قدروں اور مقصد وضرورت کے مطابق صحیح تصورات کے ساتھ پروان چڑھے اتنے سب اہتمام کے بعد نئی نسل صحیح اخلاق وصفات کے مطابق بن سکتی ہے اور ایک باعزت قوم کی حیثیت سے اپنی اصل شخصیت کے ساتھ ابھر سکتی ہے، اور اپنے معیاری مقاصد کے لئے درست طریقہ سے کام کرسکتی ہے، اور اس کو دنیا کی قوموں کے درمیان باعزت اور منفرد مقام مل سکتا ہے، ورنہ وہ ان قوموں کی تابعدار اور محتاج قوم بن کر رہ جاتی ہے، جن کی ثقافت کے اثرات اس پر پڑتے ہیں اور جن کے تمدن سے مرعوب ہو کر اپنے کو ان کا دست نگر محسوس کرتی ہے۔

آج مسلمانوں کے معاشرہ میں ان کی صحیح قدروں کا فقدان ہو رہا ہے، اس میں سب سے بڑا دخل اسی بات کا ہے کہ ایک طرف تو اسلامی فکر وروح سے بالکل متضاد فکر وروح سے مقابلہ ہے اور دوسری طرف ماں باپ کے مرحلہ سے لے کر مدرسہ اور عام سوسائٹی کے مرحلہ تک نئی نسل کو محفوظ رکھنے اور اس کو دوسری قوموں کے فکر وفلسفہ سے بچانے سے پوری غفلت برتی جارہی ہے، اس کے نتیجہ میں ہماری نجی زندگی میں دوسروں کی نقل کی وجہ سے وقتی طور پر کچھ سہولت اور راحت تو حاصل ہو جاتی ہے لیکن دوسروں کی زندگیوں کے اثرات سے ہماری نئی نسل کو اپنی اقدار اور اخلاق سے بیگانہ ہونے اور دوسری قوموں کی اقدار و تصورات میں رنگ جانے کا بڑا خطرہ پیدا ہو گیا ہے، دوسروں کے یہ طریقہ اور تصورات نہ تو ہمارے ماضی سے کوئی تعلق رکھتے ہیں اور نہ ہماری ان مذہبی اخلاقی اور معاشرتی امنگوں اور مقاصد سے جوڑ رکھتے ہیں جو ہم کو بہت عزیز ہیں اور جن سے دنیا کی قوموں کے درمیان ہماری شناخت اور ہمارا امتیاز قائم رہا ہے، مسلمان

قوم ایک معیاری، انسان دوست بلند حوصلہ، ہمدرد، بہادر اور قائدانہ صفات کی حامل قوم ہے، اس کی اپنی اقدار اور اصول زندگی ہیں، جن سے اس کی یہ صفات بنتی ہیں، اور جن کو چھوڑ دینے سے وہ اپنی ان صفات سے محروم ہو جاتی ہے۔

مسلمانوں کی سابقہ تاریخ کا جائزہ لینے سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے ماضی میں ان کی ان اقدار و صفات کو باقی رکھنے اور مضبوط کرنے کی بڑی حد تک فکر رکھی جاتی تھی، گھر میں بچہ جب کچھ سن شعور کو پہنچتا تو اسی وقت سے اس کے دماغ میں یہ تصورات پیدا کئے جاتے، اور تربیت کے مختلف پہلوؤں کا اہتمام کیا جاتا، اس میں عملی طور پر وقتاً فوقتاً کچھ کوتاہیاں بھی ہوتی تھیں، اور بعض پہلوؤں کی طرف سے غفلت بھی برتی جاتی تھی، لیکن بنیادی طور پر نئی نسل کو مسلمان باقی رکھنے کے لئے تربیت کے ضروری اور بنیادی اصول اپنائے جاتے تھے، اسی لئے مسلمان نسل اس ساری مدت میں اپنے مذہب اور اپنی ثقافت کو بڑی حد تک مضبوطی سے پکڑے رہی جس کے اثرات آج کے اس بدلے ہوئے زمانہ میں بھی ایک حد تک نظر آتے ہیں، اگرچہ تربیت کو ہمہ جہت طریقہ سے اختیار کرنے میں چونکہ کچھ کوتاہیاں ہوئیں جن کے سبب آج اس سلسلہ میں کچھ کمزوریاں فروعی یا ضمنی باقی ہیں، لیکن اب موجودہ عصر میں اسلامی تربیت و ذہن سازی کو زیادہ نظر انداز کر دیئے جانے کی وجہ سے اسلام اور مسلمانوں کی اصل قدروں اور اصلی اخلاق کا سخت فقدان پیدا ہوتا جا رہا ہے، دوسری طرف عصر حاضر کی فکر و تہذیب کے اثرات و غلبہ سے ایک خاص قسم کی پیچیدگی اور خرابی پیدا ہو رہی ہے، یورپ کی فکر و تہذیب کے غلبہ سے پرانی قدریں ٹوٹ کر ایسی قدریں بن رہی ہیں جو اسلام کے دیئے ہوئے اصول و اخلاق سے نہ صرف یہ کہ مختلف ہیں، بلکہ ان سے متضاد اور متصادم ہیں، اس کی وجہ سے خیر و شر کے بارے میں اور زندگی کے طور و طریق کے

سلسلہ میں ایسا بے جوڑ اور اصلی مزاج سے متضاد خاکہ بنتا جارہا ہے جو مسلمانوں کے مثالی ضابطہ حیات و اخلاق کے برعکس الٹی تصویر پیش کرتا ہے اسلام میں اخلاقی اقدار حیا سے اور مواخذہ آخرت کے احساس سے ابھرتے ہیں، اور اقتصادی وسیاسی تصورات زندگی کی جائز ضرورت پوری کرنے کا حق رکھنے اور دوسروں کے ساتھ قابل عمل ہمدردی کے جذبہ سے ابھرتے ہیں، مغربی تہذیب میں اس طرز کا کوئی تصور نہیں ہے، اور اگر ایسی کوئی چیز ہے تو وہ صرف سوسائٹی کی ملامت کے خطرہ کا احساس ہے، اگر کسی کی نظر میں اس طرح کا خطرہ نہیں تو پھر اس کے لئے کسی بھی عمل وحرکت میں کوئی رکاوٹ نہیں ہوتی، ان کے یہاں نہ مواخذہ آخرت کا تصور ہے اور نہ مخلصانہ ہمدردی کی اہمیت وقدر و قیمت، اس کے برعکس مادی نفع وضرر کے امکانات اور کاروباری جذبہ رکھنے والا عین دین کارفرما رہتا ہے، مرد کے لئے عورت چونکہ جاذب توجہ جسم کی حامل ہے لہٰذا ان کے یہاں اس کے لئے اس کو نمایاں اور قابل توجہ بنانے کا فلسفہ پایا جاتا ہے۔ چنانچہ اس کے جسم کے باعث التفات حصے کھلے رکھنا ان کی ثقافت میں داخل ہے، اسلام اس کو باعث فتنہ سمجھتا ہے، اس لئے اس کے نزدیک وہ باعث شر ہے، مرد کا جسم چونکہ باعث التفات نہیں اس لئے مغربی تہذیب میں اس کے جسم کا کچھ بھی کھلا رہنا پسندیدہ نہیں ہے، اس کی بنا پر یورپ کی تہذیب میں مرد کا اپنے پورے جسم کو ڈھکنا تہذیب کی قدروں میں داخل ہے، اسلام اور یورپ کی تہذیبوں میں متعدد تضاد واختلاف ہیں، مرد وعورت کے اختلاف میں، نفع وضرر کے تصورات میں، اجتماعی وانفرادی زندگی کے اصولوں میں، عام اخلاقی صفات واطوار میں یہ فرق واختلاف نمایاں ملتا ہے۔

یورپ کی تہذیب نے مساوات کا تصور بلا فرق مراتب اختیار کیا ہے یہ

اسلام کے تصور مساوات سے مختلف ہے اسلام میں مساوات کو انسانی حق تسلیم کیا جاتا ہے لیکن فطری لحاظ سے چھوٹے بڑے کمزور وقوی، عورت ومرد کے درمیان جو فرق ہے اس کا بھی لحاظ ضروری قرار دیا گیا ہے لیکن مغربی ثقافت میں اس فرق واختلاف کی پرواہ نہیں رکھی گئی ہے، چنانچہ عورت مرد کے بالکل مساوی سمجھی جاتی ہے اگر چہ دونوں کے مابین فطری سطح پر فرق ہے اور دلچسپ بات یہ ہے کہ یورپ کے مکمل مساوات کے اصول کے باوجود عورت کو عملاً مکمل مساوات کا فائدہ نہیں اس کو محنت کے معمولی کاموں میں لگایا جاتا ہے اور ذمہ داری وبلند سطح کے کاموں میں اس کو کم حصہ دیا جاتا ہے، لیکن اسلام عورت کو انسانی سطح پر مرد کے برابر رکھتا ہے اور دونوں کو برابر کی عزت دیتا ہے، لیکن جسمانی سطح پر اس کی کمی کو مانتے ہوئے اس کے فرق کا لحاظ کرتا ہے اور عملی اور جسمانی دائرے میں اس فرق کو عملی طور پر نافذ کرتا ہے۔

یورپ کی تہذیب وثقافت کے پھیلنے اور عام ہونے پر اس کی روک تھام کا تربیتی وانتظامی بندوبست نہ کئے جانے سے اسلامی قدریں اور مغربی تہذیب خلط ملط ہوتی جارہی ہے، اور اس سے ایک عجیب صورت حال رونما ہورہی ہے، اور ایسا نظام تربیت واصلاح کے ہمہ جہت اور درست طریقہ سے کام نہ کرنے کی وجہ سے ہورہا ہے، ضرورت تھی کہ مغربی ثقافت سے واسطہ پڑنے پر اسلام کے حلقہ بگوش افراد کو اس طرح متاثر ہونے سے بچایا جاتا۔ اور ان کو ان باتوں کے اختیار کر لینے سے روکا جاتا جو اسلام کی واضح اور حقیقی تعلیمات اور اسلام کے اپنے ماحول ومعاشرہ کی لائق کیفیتوں اور قدروں سے متضاد ہیں دنیا میں جو معاشرے اور تہذیبیں ہیں ان میں سے ہر ایک کے اپنے مخصوص تہذیبی نظریات اور فلسفے ہیں، ان میں سے اکثر اسلام کی زندگی کے فلسفہ سے مختلف ہیں اسی لئے جب ہم ان پیمانوں یا اصولوں کو اختیار کرتے ہیں جو دوسرے کسی مذہب یا دوسری کسی تہذیب وتمدن نے اپنائے ہیں، تو وہ

اصل اسلامی فلسفہ سے مطابقت نہ رکھنے کی وجہ سے اسلامی زندگی اور تہذیب کے مسائل کا حل پیش نہیں کرتے، وہ کسی حد تک یا ثانوی سطح پر یا دفاعی ضرورت کی حد تک ضرورت کا ایک علاج تو کہے جاسکتے ہیں لیکن وہ اسلامی فکر واصول کی نمائندگی نہیں کرتے، بلکہ وہ مزید نئے مسائل کھڑے کر دیتے ہیں، ضرورت تھی کہ ہمارے تربیتی نظام کو ہمارے تہذیب وثقافت کے فکر وفلسفہ کو سامنے رکھتے ہوئے تشکیل دیا جاتا، لیکن افسوس ہے کہ ثقافت وفکر کی بیرونی قدروں اور تصورات، اور اسلامی ومشرقی قدروں اور تصورات کے درمیان جو تضاد ہے اس کو ہمارے ماہرین تعلیم وتربیت اور اصحاب فکر وعمل نے بہت کم محسوس کیا اور اس سے پیدا ہونے والے نتائج کی طرف بہت کم دھیان دیا، حالانکہ ان کے اثرات عملا بہت دور رس رہے ہیں ہم کو یہ اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ اگر اپنی صحیح اور اسلامی قدروں اور تصورات کو مؤثر ڈھنگ سے نئی نسل کے دلوں میں اتارنے کی کوشش صحیح خطوط پر نہیں کی گئی تو طاقت وغلبہ رکھنے والی قوموں کی ان رواں دواں قدروں اور تصورات کے سامنے ہماری نئی نسل بالکل نہ ٹھہر سکے گی، اور مشرق ومغرب، اسلام وجاہلیت کی قدروں کے اختلاط واندراج سے اخلاق وثقافت کا ایک نہایت بے جوڑ طرز قائم ہو جائے گا جو بہت افسوسناک بلکہ مسلم سوسائٹی کے لئے تباہ کن ثابت ہوگا، لہٰذا ہمارے لئے اسلام کے بنائے ہوئے خطوط پر تربیت کا حکیمانہ اور مؤثر نظام تیار کرنا ضروری ہے، اور ہندوستان میں تو مزید مسئلہ ہندو تہذیب اور اس کی زندگی کی قدروں کا بھی آ گیا ہے، جس سے نئی نسل کے افراد کو اپنے اردگرد کے ماحول، اسکول وکالج سے سابقہ پڑتا رہتا ہے، اور اس کی تلافی یا مداوے کا کوئی انتظام نہیں، نہ گھروں میں ماں باپ کو فکر اور نہ باہر اہل علم وتربیت کی طرف سے کوئی بڑی توجہ، چنانچہ نوجوانوں کے لہجہ اور زبان میں ان کی زندگی اور ان کے معاملات میں ان کے طرز ورویہ میں اور زندگی کے تصورات میں خاص فرق نظر آنے لگا ہے۔ یہاں بھی طہارت اور حیا کے

سلسلہ میں مختلف نقطہ ہائے نظر کا جو فرق اسلام اور ہندو تہذیب کے درمیان ہے وہ ختم ہوتا جارہا ہے اور ایک ایسا طرز بنتا جارہا ہے جو ایک مسلمان کے لئے بالکل بے جوڑ اور اس کی اصلی قدروں اور تصورات سے بہت مختلف ہے اور یہ دراصل ہماری بے توجہی اور غفلت کی وجہ سے اور اپنی بعض راحتوں اور فائدوں کو بلند مقاصد کے لئے قربان نہ کرسکنے کی وجہ سے ہے۔

یورپ کی قومیں اپنے رائج مذہبی وثقافتی فکر وفلسفہ کے سانچے میں اپنی نئی نسل کے ذہنوں اور معلومات کو بہت توجہ سے ڈھالتی ہیں اور وہ ماں کی گود سے لے کر اسکول وکالج اور عام زندگی کے میدانوں میں اس کا بڑا موثر اور مادی نظام قائم کرتی ہیں، چنانچہ وہ نئی نسل کو خالص اس سانچے میں ڈھالنے میں کامیاب ہورہی ہیں جس کو وہ اپنے افکار وفلسفہ کے مطابق مفید وضروری سمجھتی ہیں۔

چنانچہ ہمارے ماحول ودرس گاہ میں نشو ونما پانے والا فرد ایک خالص انگلش مین (ENGLISH MAN) جبکہ فرانسیسی ماحول اور درس گاہ میں رہنے والا پورا فرنچ بنتا ہے اور امریکی ماحول و درس گاہ میں نشو ونما پانے والا پورے کا پورا امریکی بنتا ہے لیکن مسلمان اور مشرقی ملکوں میں رہنے والا فرد نہ معلوم کیا بنتا ہے وہ اپنے بعض رجحانات میں مسلمان ہوتا ہے بعض میں غیر مسلم بعض میں مشرقی ہوتا ہے، بعض میں مغربی، کیونکہ اس کا ماحول وتربیتی نظام کسی متعین سانچہ میں اسکو نہیں ڈھالتا ،اس افسوس ناک صورت حال کی ذمہ داری کس پر ہے؟

ہمارے اہلِ دانش افراد کو اس کی فکر کرنا چاہئے اوور اپنی نسلوں کو اپنی قدروں کے مطابق ڈھالنے کی تدبیر اختیار کرنا چاہئے۔

اولاد کی تعلیم وتربیت

کسی بھی انسان کی شخصیت سازی کے لئے باقاعدہ مرحلہ وار انتظام کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے، اس کام کو مرحلہ وار تین دائروں میں انجام دینا ہوتا ہے، ان میں سب سے مقدم گھریلو زندگی کا مرحلہ ہے، اس مرحلہ میں والدین اور گھر کے ذمہ دار افراد کا رول بہت اہم ہوتا ہے، اور یہیں اس کے بنیادی تصورات اور اخلاقی ذہن کی بنیاد پڑتی ہے، دوسرا مرحلۂ کار تعلیم گاہ ہے، جس میں بچہ کو گھریلو تشکیل وتربیت کے بعد داخل کیا جاتا ہے، اسے یہاں زندگی سے متعلق ضروری معلومات سے واقفیت اور انسانی زندگی کے طور طریق سے آگاہی تعلیمی انداز سے کرائی جاتی ہے، مسلمان کے لئے ان دونوں مرحلوں میں خدا و رسول کے بتائے ہوئے اصول زندگی سے آگاہ کرنا ہوتا ہے، یہ تعلیمی مرحلہ کشادہ اور وسیع ہوتا ہے، اور اس میں انسان کے قلب ودماغ کو خاص غذا فراہم کی جاتی ہے، اس لئے اس کے نظام ونصاب کو مرتب کرنے میں مسلمان کے اسلامی نقطۂ نظر واصول حیات کو مناسب جگہ دینے کی ضرورت ہوتی ہے، اسی مرحلہ میں اس کی مکمل تربیت ہوتی ہے، اور آنے والی زندگی کے مسائل کا مقابلہ کرنے کے لئے وہاں اس کو غذا فراہم کی جاتی ہے، تیسرا دائرۂ عمل معاشرتی ہے، جس میں اسکول

سے نکلنے کے بعد انسان پورے طور پر داخل ہوتا ہے، اور وہاں اسے ثقافت و معاشرت کے مسائل کا سامنا کرنا ہوتا ہے، اور ان کو حل کرنے اور انجام دینے کے لئے اپنی حاصل شدہ صلاحیتوں کو بروئے کار لاکر زندگی میں اپنا مقام بنانا ہوتا ہے۔

ان تینوں دائرہائے کار میں سب سے زیادہ اہمیت کی حامل اور بچے پر سب سے زیادہ اثر ڈالنے والی چیز گھریلو زندگی کا دائرہ عمل ہے، جس میں والدین اس کی دیکھ بھال کرتے ہیں، اور اس میں خاص طور پر والدہ کا رول بہت ہی اہم، گہرا اور اثر انداز ہونے والا ہوتا ہے، اس مرحلہ میں بڑی حد تک بچہ ایک گندھی ہوئی مٹی کی طرح ہوتا ہے، جس کی اخلاقی اور ذہنی کیفیت کو بہت ہی سہولت کے ساتھ کسی سانچہ میں ڈھالنا ممکن ہوتا ہے، بالکل مٹی کے اس برتن کی طرح جسے کمہار گیلی مٹی سے بناتا ہے، حضور ﷺ نے اسی جانب اشارہ کرتے ہوئے بچہ کی دینی صورت حال کے سلسلہ میں فرمایا "کل مولود یولد علی الفطرة، فأبواه یهودانه، أو ینصرانه أو یمجسانه" یعنی بچے اصل فطرت پر پیدا ہوتے ہیں (جو اسلامی مزاج کے مطابق ہوتے ہیں) پھر ان کے والدین اگر یہودی ہوئے تو یہودی، اور نصرانی ہوئے تو نصرانی بنا لیتے ہیں، اگر مجوسی ہوئے تو انہیں مجوسی بنا دیتے ہیں، اسی بنا پر احادیث میں بچہ کی دینی تربیت کی جانب خاص طور سے توجہ دلائی گئی ہے، اور دین اسلام کا سب سے اہم اور واجب امر یعنی نماز کے سلسلہ میں سات سال کی عمر ہو تو اس کو سمجھا کر اس کی ادئیگی کے لئے اور دس سال گزرنے پر نہ کرے تو سختی اور سزا اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے، اور ظاہر ہے کہ بچپن میں نماز کی ادائیگی کی عادت پڑ جائے تو زندگی بھر اس کی عادت رہتی ہے۔

ایام طفولیت کی فطرت و نفسیات ایسی ہوتی ہے کہ گھریلو زندگی کے جملہ

مراحل میں اس کے گرد وپیش رونما ہونے والے واقعات اور اس کے والدین اور خاندان کے اعمال وکردار اس کی زندگی پر بہت تیزی سے اثر انداز ہوتے ہیں، وہ سب سے پہلے ہر دیکھی اور سنی چیز کو سمجھنا چاہتا ہے، اور جو بھی اسے نئی چیز نظر آتی ہے اور بھا جاتی ہے اس کو اس سے دلچسپی ہونے لگتی ہے، وہ اس دنیا میں نیا نیا آتا ہے اور گرد وپیش کے امور کو اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ دیکھ رہا ہوتا ہے، تو اسے یہ دنیا اپنے نئے نئے اور خوشنما مناظر اور حالات کی بنا پر پسند آتی ہے، اور وہ اپنے والدین کے زیر تربیت ان کا مشاہدہ کرتا ہے اور ان سے باخبر ہوتا ہے، اور ان واقعات کے سلسلہ میں والدین کی وضاحت کو قبول کرتا ہے، اور ان تمام چیزوں کو قبول کرنے کے سلسلہ میں اس کی مثال پہلے مشاہدہ اور تاثر کی ہوتی ہے جو دل میں قائم ہونے کے بعد دل ودماغ پر نقش ہوجاتی ہے۔ اسی لئے والدین کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ اس کو انسانی طریقہ پر ڈھالیں، اور اس کے ذہن ودماغ میں اسلامی عقیدہ کو جمائیں، اور اس کی تربیت سلوک وسیرت کے ٹھیک طریقہ پر کریں، اس لئے کہ والدین عقیدہ کے جس بیج کو اس کے ذہن ودماغ میں بوئیں گے بچہ ہمیشہ اپنی زندگی کے تمام مراحل میں ان کو اختیار کئے رہے گا۔

بچہ کی تربیت کے سلسلہ میں ماں کو سب سے اعلیٰ مقام حاصل ہے، وہ بچہ کی ایسی اخلاقی تربیت کرسکتی ہے جو زندگی بھر باقی رہے اور ماں ہی بچہ سے نرمی سے پیش آنے اور اس سے محبت کرنے میں دوسروں پر فائق ہے، وہی اس کے آرام وراحت اور خواہشات کا سب سے زیادہ اہتمام کرتی ہے، بھلا اس سے بڑھ کر بچہ سے کون محبت کرسکتا ہے، جو اس کی ہر صدا پر ہمہ وقت لبیک کہے، اور اس کے ہر ناز ونخرے کو بسر وچشم قبول کرے، ماں کے اس رویہ سے بچہ بھی ماں سے ذہنی اور جذباتی لحاظ سے بھی وابستہ ہوجاتا ہے، اور اس کی بات کو ماننے سے برگشتہ

نہیں ہوتا، اور یہ بات اس کی تشکیل و تربیت میں اہم کردار انجام دیتی ہے، کتابوں میں بعض اہم شخصیات نے جب اپنی شخصیت سازی میں اہم کرداروں اور عوامل کا ذکر کیا تو اس میں بچپن میں اپنی ماں سے جو کچھ انہوں نے حاصل کیا تھا اس کا بطور خاص تذکرہ کیا ہے کیونکہ ان کا تاثر سب سے زیادہ اپنی ماؤں سے ہوا، اور معاشرہ کی تہذیب وثقافت کی حفاظت میں بھی ماں کا بہت اہم کردار ہوتا ہے، وہ اس گھر کی مالکہ ہوتی ہے جس میں انسانی نسل پروان چڑھتی ہے پھر اس کو مستقبل میں زندگی کے مسائل سے دوچار ہونا ہوتا ہے ان میں اسی رول کے تاثرات سے روشنی ملتی ہے۔

اسلامی تاریخ میں مسلمان ماؤں نے روشن کارنامے انجام دئے ہیں، جب ہم اسلامی شخصیات پر غور کرتے ہیں تو ہم ان میں اکثر کی ماؤں کو عزم وہمت کی بلند چوٹی پر پاتے ہیں، اور بہت سی عظیم شخصیتوں نے ان کا باقاعدہ تذکرہ و ستائش بھی کی ہے۔

بچوں کو وہ کہانیاں بہت پسند ہوتی ہیں جو عجیب وغریب باتوں اور واقعات پر مشتمل ہوں، وہ ان کو سننے کے مشتاق و بے چین رہتے ہیں، چنانچہ ذہین والدین بچوں کے دینی عقیدہ کی تعمیر اور اخلاقی ومعاشرتی تصورات کی تشکیل کے لئے ان کی اس رغبت اور خواہش سے پورا فائدہ اٹھاتے ہیں، اس سلسلہ میں نبیوں، مجاہدوں اور غازیوں، فاتحین اور اولیاء، وصالحین کے قصے خاص طور پر مفید ثابت ہوتے ہیں اور کہانیوں میں اصلاحی پہلوؤں کو اجاگر کرنا بہت اچھا ہوتا ہے، جن گھروں میں سونے سے قبل بچوں کو ان کے شوق کی کہانیاں سنائی جاتی ہیں وہاں اس اصلاحی پہلو کا خیال رکھنا بہت بہتر ہوتا ہے، اسی طرح بچوں کو قرآن کریم کی آیتوں کی تعلیم دینا اور ان کے خالی اوقات میں ان کو کچھ مختصر دعائیں

یاد کرانا اور پھران کا تکرار واعادہ اوران سے سوال و جواب بھی فائدہ بخش ہوتا ہے۔اس کے ساتھ ساتھ والدین کے لئے ضروری ہے کہ وہ بچوں کے سامنے کوئی ایسی بات نہ کریں جوانہیں اچھے اخلاق سے دور کردے،اور جو حیا کے منافی اور عزت وشرافت سے الگ ہو کیونکہ بچے بھی اپنے والدین کی جانب سے صادر ہونے والے ہر قول وفعل کو خواہ اچھے ہوں یا برے، ہر حال میں قبول کر لیتے ہیں۔اور والدین کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ بری باتوں سے اجتناب کے پہلوؤں کو واضح کریں، اور ان سے باز رکھنے کے لئے بچوں کے سامنے سلف صالحین کے مثالی واقعات پیش کریں۔

تہذیب حاضر کے اثر ونفوذ اور کسب معاش کے کاموں میں مشغول ہونے کی وجہ سے اکثر والدین اپنے بچوں کو تربیت گاہوں یا بورڈنگ ہاوس میں داخل کردیتے ہیں، اس لئے ایسی صورت حال میں ان کو چاہیے کہ وہ بہترین تربیت گاہوں کا انتخاب کریں اور عقائد کی صحت اور استقامت کی زندگی کو اپنانے کا پورا خیال رکھیں، اولاد کی تعلیم وتربیت میں گھریلو تربیت کی بنیاد مضبوط کر کے ہی اولاد کو آگے کے نظام تعلیم وتربیت میں منتقل کریں تا کہ اس آگے کے مرحلہ میں اولاد کو تردد اور بے جہتی کی کشمکش سے سابقہ نہ پڑے، اور وہ اپنے اصل سرپرستوں کے مقصد حیات اور اقدار سے دور نہ ہو سکے۔

تعلیم گاہ میں پہونچنے کے بعد وہاں کے نظام کے سلسلہ میں اصل ذمہ داری اصلاً تعلیمی اداروں کے ذمہ داروں کی ہوتی ہے، جو درسگاہ کا نظام تعلیم وتربیت طے کرتے ہیں، اس سلسلہ میں طلبہ کے سرپرستوں کے کرنے کا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ درس گاہوں کے معاملہ میں بہتر سے بہتر انتخاب سے کام لیں، اور پھر اپنے بچوں کو وہاں داخل کریں، اس طریقہ سے تعلیم کی جو اہمیت ہے اس کے مطابق

عمل درآمد کی صورت بنتی ہے اور یہ بات کسی بھی دانشمند سے پوشیدہ نہیں کہ انسانی معاشرہ کی تشکیل میں باقاعدہ تعلیمی نظام کا کتنا بڑا حصہ ہوا کرتا ہے؟ اور صالح نسلوں کی تیاری میں اس کا کیا کردار ہوتا ہے؟ یہی وجہ ہے کہ بعض اہل علم اور تعلیمی اصول مرتب کرنے والے افراد نے بہت سے ملکوں کے اندر لوگوں کے فکری رجحانات کو بدلنے اور ان کے افکار و خیالات کو نیا رنگ دینے میں اس وقت سرخروئی حاصل کی جب انہوں نے اس مقصد کے لئے تعلیم کا سہارا لیا اور اس کو وسیلہ بنایا۔

تعلیم گاہوں کا کردار تین بنیادوں یعنی طالب علم، معلم اور نصاب تعلیم پر انجام پاتا ہے، جب ان میں کوئی بھی ناقص اور نامکمل ہوتا ہے تو مقصد کے حصول میں وہ کامیابی نہیں ہوتی جو ہونا چاہیئے، لہذا کسی بہتر معاشرہ کے قیام کے لئے ضروری ہے کہ ان تینوں بنیادی چیزوں کی درستگی کا اہتمام کیا گیا ہو۔

نصاب تعلیم طالب علم کے لئے غذائی انتظام کی حیثیت رکھتا ہے بالخصوص زبان و ادب اور سماجی علوم میں تو خاص اہتمام کی ضرورت ہے، بہر حال نصاب تعلیم کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ اخلاقی بگاڑ اور گمراہیوں کے اثر سے پاک و صاف تیار کیا جائے، اور صالح اسلامی معاشرہ کے تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کے مطابق نصاب تعلیم مرتب کیا جائے جو اپنے پڑھنے والوں اور ان کے سرپرستوں کے تصور و عقیدہ سے نیز ان کے اس معاشرہ کے مطمح نظر اور قدروں سے ہم آہنگ ہو، جس میں طالب علم سانس لیتا اور اپنے شب و روز گذارتا ہے۔

اکثر تعلیمی نقطہائے نظر جو اس دور میں یورپ میں مرتب ہوئے اور مشرق میں بھی جنہوں نے اپنی افادیت کا سکہ جمایا، ان میں سب نے آزادئ خیال کو اپنے تعلیمی نظریہ کی بنیاد بتایا، ان میں سے بیشتر نے مذہب کی بالادستی اور زندگی

کے میدان میں اس کی رہنمائی کو مسترد کر دیا ہے، وہ انسان کے لئے اخلاقیات کی پابندی کو بھی قبول نہیں کرتے، بلکہ ان کو آزاد چھوڑ دینا چاہتے ہیں، لیکن مسلمان طالب علم کا معاملہ مختلف ہے، اس کے لئے مقصد اور طریقہ کار دونوں کا ہی نیک اور مفید ہونا ضروری ہے اور اس کو اخلاقیات کا بھی پابند ہونا ہے۔

مسلمانوں کا نصاب تعلیم تین قسم کے موضوعات پر مشتمل ہوتا ہے، ان میں ایک قسم طبیعیاتی اور ان سے متعلقہ علوم کی ہے، دوسری قسم زبان و ادب اور سماجی علوم کی ہے، تیسری قسم اخلاقی و مذہبی علوم کی ہے، جو نصاب بنایا جائے گا اس میں ان تینوں قسموں کا اشتراک رکھنا ہوگا، اس لئے کہ انسانی زندگی کی تشکیل میں یہ تینوں اپنی اپنی جگہ پر اثر ڈالتے اور کام کرتے ہیں۔

الغرض معاشرہ کی اصلاح و تربیت کے میدان میں تعلیمی نظام کا بڑا اہم کردار ہوتا ہے لیکن اس کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ اس کے اندر اسلامی معاشرہ کی بہتر اور متوازن زندگی کے تمام پہلوؤں کی رعایت کی جائے۔

دینی و تعلیمی کام کی اہمیت اور ضرورت

ہندوستان کو آزادی ملنے پر مسلمانوں کو اقلیت میں ہونے کے باعث سخت حالات کا سامنا تھا، یہ حالات مسلمانوں کے مذہبی عقیدہ اور ان کے اسلامی تشخص کے لئے ایک طرح سے چیلنج بننے لگے تھے، اس صورت حال کے پیش نظر امت کے غیرت منداور اسلامی تشخص کو برقرار رکھنے کا مخلصانہ جذبہ رکھنے والے اہم افراد اکٹھا ہو کر اس عزم پر متفق ہوئے کہ مسلمانوں کی نئی نسل کو جو اس نئے آزاد ہونے والے ملک میں جہاں کے مسلمان اقلیت میں ہیں، ملک کی عام فضا جو اسلامی فکر و عقیدہ کے موافق نہیں ہے، اس سے بچانے کے لئے اس کے ابتدائی مرحلہ ہی میں ضروری قدم اٹھانا ہے اور کوئی بہتر نظام طے کرنا ہے، کیونکہ نئی نسل کسی بھی قوم کی ہو، کسی بھی ملک کی ہو، اپنے ماں باپ کے ماحول سے نکل کر جب دوسروں سے سیکھنے اور اثر لینے کے مرحلہ میں داخل ہوتی ہے تو اپنے اخلاق و کردار اور عقائد و افکار پر ان کا پورا اثر قبول کرتی ہے، اور اس طرح وہ اپنے مذہب و ثقافت کے لحاظ سے دیگر مذہب و ثقافت والوں سے مختلف ہونے کی وجہ سے ورثہ میں حاصل کردہ اخلاق و کردار سے محروم ہو جاتی ہے، ان منفی اثرات سے بچانے کے لئے اگر ابتداء ہی میں ضروری تدابیر اختیار نہیں کی

جاتیں تو یہ نسل بڑی ہوکر اپنی ملت وقوم کے طور طریق پر چلنے والی نہیں ہوتی اور اس کا فکر وخیال غیروں سے ماخوذ ہوتا ہے۔

لہٰذا ملت کے دانشوروں کا یہ فریضہ ہوتا ہے کہ نئی نسل کی ابتدائی تعلیم ہی میں ان باتوں کو بچوں کے ذہن میں پیوست کرنے کا نظام بنائیں کہ جن سے ان کے ملی اور ایمانی تشخص کی بنیاد مضبوط پڑ جائے، اسی ضرورت کی اہمیت کو سامنے رکھ کر دینی تعلیمی کونسل کی تشکیل عمل میں لائی گئی تھی اور کونسل نے اپنے فریضہ کو انجام دینے کی فکر کی اور اپنے گزشتہ نصف صدی کے دور میں مسلمان بچوں کی ابتدائی تعلیم کے ایسے مکاتب قائم کئے جن میں شہری زندگی کے مضامین کے ساتھ دینی واسلامی عقائد اور دین کی بنیادی باتیں بچوں کے ذہنوں میں اتاردی جائیں اور اس کا نظام ایسا بنایا جو ایک طرف اقتصادی لحاظ سے خود کفیل تھا اور دوسری طرف ملک کے سیکولر نظام کے تعلیمی ڈھانچہ سے دستوری لحاظ سے متصادم بھی نہ تھا اور یہ اس لئے کہ دستور ہند کے دائرہ میں رہنے کی پابندی کی بنیاد پر اس کو اکثریت یا حکومت کی طرف سے رکاوٹ پیش نہ آئے اور تیسری بات یہ بھی پیش نظر رکھی گئی کہ کونسل کو اس بات کا بھی جائزہ لیتے رہنا ہے کہ ملک کے سیکولر دستور کے دائرہ میں رہتے ہوئے حکومت وقت کو بھی اس بات کی پابندی رکھنا ہے کہ وہ ملک کے شہریوں کے لئے ایسا نصاب تعلیم اختیار نہ کرے جس میں اکثریت کو اکثریت کا مقام حاصل ہونے کی بنا پر اسکے مذہب کے عقائد ورسوم کی پابندی عائد کی جائے، لہٰذا دینی تعلیمی کونسل کے ذمہ داروں نے اس بات کو بھی اپنے پروگرام میں رکھا کہ حکومت کے اسکولوں میں جاری کردہ نصاب تعلیم میں مذہبی عقائد کی کوئی ایسی بات نہ آئے جس سے ایک مذہب کی رعایت میں دوسرے مذہب کی خلاف ورزی ہوتی ہو۔

اس وقت ہم جب ملت کی باعزت اور قدروں کی حامل زندگی کے حالات کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمارے شعور میں بے چینی پیدا ہو جاتی ہے کیونکہ اس ملک کے مسلمانوں کے اپنے ملی تشخص کے بقا کے حالات میں بڑی سنگینی نظر آتی ہے، اسی کے ساتھ مسلمانوں کے ملی شعور میں خاصی کمی نظر آتی ہے، اگر عوام کی طرف سے دینی وملی کام کی پوری ہمت افزائی نہیں ہوتی اور اس کو جس طاقت کی ضرورت ہے اس کو وہ طاقت اپنی ملت سے پوری پوری حاصل نہیں ہوتی تو اسکے کرنے والے جو بھی پروگرام بنائیں اور جو بھی نظام طے کریں وہ ملت کی ضرورت کو زیادہ پورا نہیں کرسکتا اور جب کہ اس ملک میں فرقہ وارانہ منفی ذہنیت کی وجہ سے بڑے نقصانات سامنے آرہے ہیں اور ملت کی زندگی کی اعلیٰ قدروں میں تبدیلی پیدا کئے جانے کے اثرات ظاہر ہونا شروع ہو گئے ہیں، ایسی صورت میں دینی و تعلیمی کام کی اہمیت بہت زیادہ سامنے آرہی ہے اور اس کو عوام میں تقویت ملنے میں کمی پائے جانے سے افسوس ہوتا ہے، اور مستقبل کے خطرات کا احساس بڑھ جاتا ہے

گزشتہ زمانہ میں جب اس ملک میں مسلمانوں کا وقار اور عزت صحیح مقام پر تھی اور ان میں اپنی ملی قدروں کا احساس بھی عام تھا تو مسلمانوں کی آغاز عمر کی نسل کا نشو ونما ان کے بڑوں کی توجہ کے ساتھ ہوتا تھا اور مناسب تربیت پاتی تھی اور وہ یہاں پھیلے ہوئے عقیدہ شرک سے اجتناب کے ساتھ اور خدائے واحد کی عظمت اور اس کی صحیح تابعداری کے احساس کے ساتھ اور امت مسلمہ کے صحیح عقائد ورجحانات ومبادیٔ سے واقفیت اور ان پر یقین کے ساتھ پروان چڑھتی تھی گھروں میں اور گھروں سے باہر مسجدوں میں اس نئی نسل کو آغاز عمر ہی سے صحیح دینی غذا ملنی شروع ہو جاتی تھی جس کے انجام دینے والے گھر کے بزرگ اور بوڑھے افراد ہوتے تھے، اس کے ساتھ مسجدوں کے امام ومؤذن حضرات سے

مدد لی جاتی تھی، یہ سلسلہ جدید ہندوستان میں اب موقوف ہو چکا ہے اور اس کا کوئی متبادل سلسلہ باقاعدہ قائم نہیں، اب صرف نئی نسل کے وہی بچے ان خطرات سے محفوظ ہو پا رہے ہیں جو علوم دینیہ کے مدارس میں بھیجے جاتے ہیں، لیکن ان کی تعداد سو میں تین چار سے زیادہ نہیں، باقی تعداد دینی اقدار کے لحاظ سے برباد ہو رہی ہے کیونکہ گھروں میں وہ سابق نظام باقی نہیں رہا، اور اس کے بجائے بازاروں کی اشتہاری دنیا اور روزانہ اخبارات کی طرف سے غیر محتاط رخ دینے اور پھر ٹی وی کے پروگرام جن سے ہمہ دم سابقہ پڑتا ہے، وہ نئی نسل کو کس خطرناک تغیر کی طرف لے جا رہے ہیں اس کا اندازہ سب کر سکتے ہیں، ایسی صورت میں اگر ہم ان حالات کو بدل نہیں سکتے کیونکہ یہ ملک کی قومی زندگی میں اس طرح سرایت کر گئے ہیں جس طرح پانی میں کسی رنگ کی آمیزش سے رنگ سرایت کر جاتا ہے، تو کم از کم ہم اس کا کچھ بدرقہ اختیار کر سکتے ہیں اور وہ بدرقہ ہمارے یہ ابتدائی تعلیم کے اسلامی پرائمری مدارس ہیں جو دینی تعلیمی کونسل اور اسی جیسے عوامی اداروں کی سربراہی میں عوامی وسائل سے چلائے جاتے ہیں، ان میں قومی اسکولوں میں دی جانے والی ذہنی تشکیل کی غذا سے جو ایک مسلمان کو اپنی ملی اور دینی قدروں سے ہٹانے والی ہے، سابقہ پڑنے سے پہلے ہی مسلمان بچوں کو اپنے خدائے واحد اور رسول خاتم النبیین ﷺ سے متعارف کرایا جاتا ہے اور ان سے ان کا مذہبی اور عقائدی رشتہ قائم کیا جاتا ہے، کہ وہ اپنے عقائد کو غیروں کے عقائد کے سامنے تحلیل ہونے سے بچا سکیں۔

مسلمانوں کے لئے مذہب کے سلسلہ میں یہ جاننا اور ماننا ضروری ہے کہ ان کا مذہب توحید کا مذہب ہے جس میں خدا کو ایک ماننا اور تنہا اسی کی بندگی کرنا ضروری ہے وہ شرک کی کسی قسم و شکل کو قبول نہیں کرتا، نیز یہ کہ مذہب اسلام بالکل

کامل ومکمل مذہب ہے، زندگی کے تمام معاملات میں وہ خیر خواہانہ رہنمائی کرتا ہے، اس کے نبی حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ اللہ تعالیٰ کی طرف سے انہی تعلیمات کے لئے بھیجے گئے، ان کی تابعداری اوران کے احکام پر عمل ضروری قرار دیا گیا، اسلام میں یہ جاننا اور ماننا بھی ضروری قرار دیا گیا کہ انسانوں کی موجودہ زندگی کے بعد دوسری زندگی بھی ہوگی جس کو آخرت کہتے ہیں جہاں ہماری اس دنیا کی زندگی میں کئے گئے ہمارے اچھے اور برے کاموں کا بدلہ ملے گا، اسلام کوئی زبردستی کا مذہب نہیں ہے، وہ کسی پر زبردستی کرکے اپنے کو ماننے پر مجبور کرنے کو نہیں کہتا، وہ اچھی باتوں کی طرف دعوت دیتا ہے اور سب انسانوں کے ساتھ خواہ گورے ہوں یا کالے، امیر ہوں یا غریب، سب کے ساتھ برابری کا معاملہ کرنے کی تلقین کرتا ہے۔

اسلام نے ہم کو جو تعلیمات دی ہیں ان کا جاننا اور ماننا ہر مسلمان کے لئے ضروری ہے، چنانچہ ہم کو اس ملک میں جہاں طرح طرح کے عقیدے اور مذاہب ہیں، اپنی نئی نسل کے ذہنوں کو ان کی عمر کے آغاز ہی میں اسلام کے صحیح عقیدہ وعمل سے واقف کرادینا ضروری ہے، تاکہ وہ اپنے صحیح راستہ سے بھٹکنے سے محفوظ رہیں، ہمارے دینی تعلیمی اداروں کی ساری جدجہد یہی ہے، جب ابتدائی مرحلہ کے بعد تعلیم کے قومی نظام میں شامل ہو تو اس کے عقائد اور دینی بنیاد صحیح قائم ہوسکے اور وہ اپنے کو مسلمان ملت کا فرزند سمجھے اور اپنی بنیادی قدروں سے آشنا ہو، اس میں اس کو دھوکہ کھانے سے اور غیروں کے مخالفانہ اثرات سے محفوظ رہنے کا راستہ مل جائے گا۔

اس کی فکر بڑھانا چاہئے کہ دینی وتعلیمی کام زیادہ ہمت اور توجہ سے انجام دیا جائے اور زیادہ سے زیادہ علاقوں میں مکاتب قائم ہوں اوران کے ذریعہ نئی نسل

کے دل و دماغ میں اسلام کے بنیادی عقائد و مسائل راسخ کر دئے جائیں تا کہ اس کے ذریعہ کم سے کم ان کا اسلامی ذہنی تشخص محفوظ رہے اور وہ اپنے اس قیمتی تشخص سے محروم نہ ہو جائیں، سب کو اس کی فکر کی ضرورت ہے کہ ہم اس ملک میں اپنے ایمان و اسلام کی سلامتی کے ساتھ زندگی گزاریں اور ہمارا یہ عقیدہ اور یہ اسلامی تشخص ہم سے چھینا نہ جا سکے، اس کے لئے اس کام سے دلچسپی بڑھانے کی اور اس کے لئے مناسب کارگزاروں کے آگے بڑھنے کی اور کام کے سنبھالنے کیلئے سامنے آنے کی ضرورت ہے۔

باب دوم

اصلاح معاشرہ

- اصلاح معاشرہ کیوں اور کیسے؟
- ہمارے معاشرہ کے قابل اصلاح پہلو
- عمل صالح اور حسنِ تدبیر
- عزم و ہمت اور عمل پیہم
- خودرائی، غیبت اور جھوٹ معاشرہ کے تباہ کن روگ
- معاشرہ میں اسلامی نظام اقتصادیات کی تطبیق کی ضرورت
- مالی اداروں کو سود سے پاک کی ضرورت

اصلاح معاشرہ کیوں اور کیسے؟

مسلمانوں کو اپنے دین پر عمل کرنا اور اپنے عائلی معاملات کو شریعت اسلامی کے احکام کے مطابق انجام دینا کتنا ضروری ہے، اس کو قرآن کریم اور حدیث شریف کی تعلیمات سے بخوبی سمجھا جاسکتا ہے، مسلمانوں کی شریعت ان کی زندگی کے تمام پہلوؤں میں رہنمائی کرتی ہے۔ ان کی زندگی کی مشکلات کا حل بتاتی ہے، ان ضرورتوں کا حل بتانے والی شریعت سے روگردانی کرنا نہ صرف یہ کہ بڑی محرومی کی بلکہ خدا کو سخت ناراض کرنے والی بات ہے۔ اس سے مسلمانوں کو اپنے پروردگار کی مدد و رحمت سے محرومی ملتی ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے سخت پکڑ ہونے کا اندیشہ ہوجاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب قرآن مجید میں صاف صاف فرمادیا ہے کہ اسکو اپنی طرف سے عطا کردہ دین و شریعت کی خلاف ورزی بالکل قبول نہیں، فرمایا:

﴿وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِيْناً فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِي الْآخِرَةِ مِنَ الْخَاسِرِيْنَ﴾ (سورہ آل عمران:۸۵)

"اور جو شخص اسلام کے سوا کسی اور دین کا طالب ہوگا وہ اس سے ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا اور ایسا شخص آخرت میں نقصان اٹھانے والوں میں ہوگا"

﴿اَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُوْنَ ط وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ حُكْماً لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ﴾ (سورۃ المائدہ:۵۰)

"کیا یہ زمانہ جاہلیت کے حکم کے خواہش مند ہیں؟ اور جو یقین رکھتے ہیں ان کے لیے خدا سے اچھا حکم کس کا ہے؟"

اللہ تعالیٰ نے اپنا یہ دین اور شریعت اپنے آخری نبی سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ مسلمانوں کو عطا کیا، اور اپنے اس آخری نبی کے احکامات اور فیصلوں کو ماننا ضروری قرار دیا اور یہ فرمایا کہ اس کے مانے بغیر کوئی مسلمان مسلمان نہیں رہتا، فرمایا:

﴿فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا﴾ (نساء:۶۵)

"تمہارے پروردگار کی قسم یہ لوگ جب تک اپنے تنازعات میں تمہیں منصف نہ بنائیں اور جو فیصلہ تم کردو اس سے اپنے دل میں تنگ نہ ہوں بلکہ اس کو خوشی سے مان لیں تب تک مومن نہیں ہوں گے۔"

لیکن سخت افسوس کی بات ہے کہ مسلمانوں میں اپنی شریعت کے مطابق زندگی گزارنے سے بڑی بے توجہی پیدا ہوگئی ہے، اس کے احکامات کی تعمیل کے بجائے دوسروں کے رسم ورواج پر عمل کیا جانے لگا ہے، جو کہ ایک طرف خدا اور

اس کے رسول کی نافرمانی اور ان کی ناراضی کا باعث ہے۔ دوسری طرف مسلمانوں کا بحیثیت مسلمان ثابت ہونا مشکل ہوگیا ہے۔ وہ اپنے دین فطرت اسلام کے طور وطریق اختیار کرنے کے بجائے جاہلانہ ومسرفانہ اور بے جا طور و طریق کو اختیار کرنے والے اور غیروں کی رسموں کو اپنا وطیرہ بنانے والے بنتے جارہے ہیں۔

ایسی صورت حال کچھ تو غفلت اور نفس پرستی کے سبب ہوئی ہے اور کچھ اپنی شریعت سے ناواقفیت کی بنا پر ہوئی ہے۔ غفلت اور نفس پرستی کو دور کرنے کے لیے وعظ ونصیحت کی ضرورت ہے اور ناواقفیت کا علاج ان کو شریعت کے ضروری احکام سے واقف کرانے سے کیا جاسکتا ہے۔

اسی لیے اس ملک میں جہاں کا دستور سیکولرزم پر مبنی ہے اور مسلمان اقلیت میں بھی ہیں، حکومت سے توقع نہیں کی جاسکتی، اس کو ملت اسلامی کے فرزند ہی انجام دے سکتے ہیں، کیوں کہ اپنی ملت کو استوار اور محفوظ رکھنے کی ذمہ داری خود انہی کی ہے شریعت اسلامی کے سلسلہ کے معاملات کا ملک کے عدالتی ودستور سازی کے اداروں سے جو تعلق ہے اس کے لیے الحمدللہ حکومت کے سامنے مدافعت کرنے اور غلط فہمیاں دور کرنے کی جدوجہد مسلم پرسنل لا بورڈ کے ذمہ داروں نے انجام دی ہے اور شریعت اسلامی کو نقصان پہنچانے والے بعض ضابطوں کو بدلوایا اور اس دائرے میں جب کوئی نئی پیچیدگی ہوتی ہے، بورڈ اس کی فکر کرتا ہے اور اس کے لیے جدوجہد کرتا ہے۔ اسی طرح اس محاذ پر الحمدللہ ضرورت کے مطابق کام انجام پارہا ہے۔

دوسرا محاذ خود مسلمانوں کو شریعت اسلامی پر عمل کرنے کے دائرے میں لانے کا ہے، جو سب سے وسیع اور اہم ہے، اس کے لیے بورڈ نے دیگر ملی

اداروں کی مدد سے اصلاح معاشرہ کے عنوان سے کام شروع کیا ہے، یہ کام زیادہ وسیع اور انتھک محنت کا کام ہے، ضرورت ہے کہ اس کے لیے جگہ جگہ اجتماعات کیے جائیں، عامۃ المسلمین کو شریعت اسلامی کے احکام کی خلاف ورزی سے روکا جائے، ان کے معاملات میں غیر اسلامی رسمیں اور طریقے داخل ہو گئے ہیں، جن سے پروردگار کی مرضی، اور اس کے آخری نبیؐ کی تعلیمات کی خلاف ورزی ہو رہی ہے، اس سے باز رہنے کی تلقین کی جائے، تاکہ دنیا و آخرت دونوں میں جو نقصان وتباہی کا خطرہ ہے وہ دور ہو۔

نکاح وشادی میں غیر ضروری نمائش وآرائش، مسرفانہ اخراجات اور جاہلانہ رسمیں وہ غیر عاقلانہ طریقے ہیں جن سے ایک طرف تو خدا اور رسول کو ناراض کیا جا رہا ہے اور دوسری طرف وہ قیمتی سرمایہ جو خود زوجین کے مستقبل کی تعمیر اور ملت کے ضروری کاموں میں لگایا جا سکتا ہے، ضائع ہوتا ہے۔ اور اسی کے ساتھ اس کا صرف کرنا لڑکی لڑکے کے والدین کے لیے سخت بار کا باعث بھی بنتا ہے۔ ضرورت ہے کہ اس کی اصلاح کے لیے لوگوں کو سمجھایا جائے کہ وہ محض وقتی لطف اور نام ونمود کے لیے اس طریقے سے اپنے اقتصادی مستقبل کو بھی نقصان پہنچاتے ہیں اور ملت کے ضروری تقاضوں کو پورا کرنے میں جو حصہ لیا جا سکتا ہے اس سے بھی قاصر رہتے ہیں پھر اپنے پروردگار اور اس کے آخری نبی کے احکام کی خلاف ورزی کر کے ان کو ناراض کرتے ہیں، یہ ناراضی ان کے لیے دنیا و آخرت دونوں میں نقصان کا باعث بنتی ہے۔

نکاح وشادی کے معاملات میں شریعت اسلامی کے طے کردہ مفید اور معتدل طریقہ کی پابندی نہ کر کے زوجین کے مابین تعلقات بعض وقت سخت کشیدہ ہو جاتے ہیں کہ تلخی اور بعض ظالمانہ طریقہ سے علاحدگی، طلاق، جان کی ہلاکت تک نوبت پہنچتی ہے، یہ صحیح ہے کہ زوجین کے درمیان بعض وقت صحیح طریقۂ کار

اختیار کرنے کے باوجود علاحدگی کی ضرورت پیش آجاتی ہے اس کے لیے شریعت نے طلاق کا ذریعہ مہیا کیا ہے لیکن اس کا مناسب طریقہ بتایا ہے، وہ یہ کہ پہلے اہل تعلق کی طرف سے میل و ملاپ کرانے کی کوشش کی جائے اور کام نہ ہونے سے ایک ایک کرکے تین مہینہ میں طلاق دی جائے، بیشتر فقہی مسلکوں میں انتہائی ضرورت پر ایک مرتبہ میں طلاق دے کر علاحدگی کی جاسکتی ہے اگرچہ اس کو مستحسن قرار نہیں دیا گیا ہے۔ مکمل علاحدگی طے کر لینے پر "تسریح باحسان" خوبی و ہمدردی کے طریقہ سے رخصت کرنے کی تلقین کی گئی ہے اور دلداری کی شکل بتائی گئی ہے۔ بہت سے مسلمان ان ہدایات کو نظر انداز کرکے خراب صورت حال پیدا کر دیتے ہیں۔ اسی طرح تقسیم میراث کا معاملہ ہے، رشتہ داروں کے ساتھ حسن سلوک کا مسئلہ ہے اور دیگر عائلی معاملات ہیں، پھر ایک اہم بات شراب اور جوئے کی بدعادتیں ہیں، شراب اور جوئے کو شریعت نے حرام اور سخت قابل مذمت فعل بتایا ہے اس سے مال و متاع کی بربادی اور عائلی زندگی تباہ ہوتی ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ خدا اور اس کے رسول کی سخت ناراضگی کا باعث بنتا ہے۔ جوئے کی ایک عام رائج شکل موجودہ زمانہ میں لاٹری ہے جس سے فائدہ اٹھانے کے بہت کم امکان کی بنا پر بہت سے مسلمان اپنی آمدنی کا بڑا حصہ اس کی نذر کر دیتے ہیں اور وہ خود اور اس کے بیوی بچے ضروریات زندگی کو بھی پورا کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔

اس طرح کی غلط کاریاں مسلمان ملت کی زندگی کو گھن کی طرح لگتی جارہی ہیں اور زندگیاں تباہ کر رہی ہیں، ہمارے داعی حضرات اور جن کو خدا نے زبان یا قلم کی مؤثر صلاحیتیں عطا کی ہیں ان کا فرض ہے کہ وہ آگے آئیں اور مختلف طریقوں سے ان خرابیوں کو دور کرنے کی کوشش کریں۔

ہمارے معاشرہ کے قابل اصلاح پہلو

افراد انسانی کا اجتماعی ڈھانچہ جس کو سماج کے لفظ اور معاشرہ کی اصطلاح سے موسوم کیا جاتا ہے صالح تشکیل و تنظیم کے بعد ہی مطلوبہ اور اچھے نتائج پیدا کرتا ہے، اس کے متعین طرز عمل کی پابندی سے ہی ثقافت، تہذیب اور متعدد سماجی قدروں کا ظہور ہوتا ہے جن سے انسانی زندگی کی رنگارنگی ظاہر ہوتی ہے، نیز ایک معاشرہ دوسرے معاشرہ کے مقابلہ میں اپنی خصوصیات کا مظاہرہ کرتا ہے۔

کسی بھی انسانی سماجی ڈھانچہ کی زندگی کا طرز بنانے میں حکومت وقت اور اجتماعی کام کرنے والی انجمنوں اور سماجی مصلحین کا بڑا کردار ہوتا ہے، یہ کام حکومتوں کا ہوتا ہے کہ سماج کے بڑے ڈھانچہ کو شائستہ رکھنے کے لئے وہ اپنے وسائل اور دلچسپی کو بروئے کار لائے، اس میں نظام تعلیم اور انتظامی تدابیر سے کام لینا پڑتا ہے، لیکن افسوس یہ ہے کہ مشرقی حکومتیں اس سلسلہ میں بہت کوتاہی برتتی ہیں، اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ہمارے مشرقی میں حکومتوں کو اپنے اقتدار کے بقا کے لئے جو توجہ صرف کرنا پڑتی ہے اس میں ان کی جدوجہد کا بڑا حصہ صرف ہو جاتا ہے، اس طرح قوم کی اخلاقی خوبی، اس کی تہذیبی درستگی اور سماجی شائستگی کا کام بہت کم ہو پاتا ہے۔

ترقی یافتہ مغربی ممالک میں سماجی نظم وضبط کی خاصی فکر کی جاتی ہے،

لیکن مشرق ومغرب کی زندگیوں کے فلسفے الگ الگ ہیں، اس لئے مغربی ممالک کی اختیار کردہ تمام تدابیر مشرقی ممالک کی فکر سے پوری ہم آہنگی نہیں رکھتی ہیں۔

مغربی ممالک میں زیادہ اہتمام نظم وضبط، تعلیم وصنعت نیز ظاہری صفائی تک محدود ہے، مادی نفع وضرر پر اس کی فکر مرکوز رہتی ہے، اس کے برعکس مشرقی قوموں میں مذہبی وانسانی اقدار سے زندگی کو استوار کرنے کی فکر ہوتی ہے، اور نظم وضبط وصفائی اور تعلیم کے معاملہ میں انسانی قدروں اور تقاضوں کا لحاظ کیا جاتا ہے، لیکن عصر جدید میں ہمارے مشرقی معاشروں کی حالت بہت گرتی جارہی ہے اور خرابی میں مسلسل اضافہ ہورہا ہے۔

بہرحال اجتماعی زندگی کی صالح اور بااخلاق تشکیل وتنظیم وہ عمل ہے جس کے ذریعہ کوئی انسانی معاشرہ جنگل کے معاشرہ سے برتر اور بہتر بنتا ہے، اور اس سلسلہ میں غفلت کرنے سے جنگل کے معاشرہ سے قریب تر ہوجاتا ہے، اس لئے ذی علم وحساس افراد کو اپنے معاشرہ کی بہتری کے لئے اسلامی تعلیمات کے مستند ذخیرہ میں سماجی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر خاصا مواد ملتا ہے، حضور محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم وتربیت کا کوئی اہم پہلو نہیں چھوڑا ہے، سب کے لئے واضح ہدایات دی ہیں اور اس طرح انسانوں کی سماجی زندگی کو ستھرا اور شائستہ بنانے کی کوشش کی ہے، آپ کی یہ کوشش صرف فکر وہدایات کے دائرہ تک محدود نہیں رہی بلکہ انسانوں کے جس معاشرہ سے حضور محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو براہ راست واسطہ پڑا آپ نے اس کی عملاً تربیت فرمائی اور یہ تربیت بے مثال ثابت ہوئی، پوری انسانی تاریخ میں اس معاشرہ سے اچھا معاشرہ آج تک قائم نہیں ہوسکا اور آئندہ بھی اس کی توقع نہیں یہ وہ معاشرہ ہے کہ کم از کم مسلم معاشروں پر اس کی نقل کرنے کی کوشش کرنا رہتی دنیا تک فرض ہے، بلکہ یہ معاشرہ تمام انسانی

معاشروں کے لئے بھی بہترین اسوہ اور معیار ہے، غیر مسلم معاشرے بھی اگر اس پر عمل کرنے کی کوشش کریں تو اس کے مفید نتائج کا وہ بھی تجربہ کر سکتے ہیں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سماجی تعلقات و معاملات کے تمام قابل عمل پہلوؤں کی تحسین و اصلاح پر زور دیا ہے اور اتنا زور دیا ہے کہ ان کی فضیلت یا خرابی مذہب، مذہبی خوبی یا خرابی سے بھی زیادہ بتائی گئی ہے، اور آپ کے ارشادات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اگر ان میں کمزوری ہے تو عبادت میں زیادتی بھی کام نہیں آسکتی بلکہ وہ ضائع ہو جاتی ہے۔

لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ ہمارے مصلحین کی توجہ ان امور پر اتنی صرف نہیں ہو رہی ہے جتنی ہونا چاہئے اس کی وجہ سے معاشرتی زندگی میں بعض ایسی خرابیاں پیدا ہو گئی ہیں جن سے اسلامی معاشرہ کا پورا چہرہ گندہ ہو جاتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ ایسے ایسے مسائل بھی کھڑے ہو جاتے ہیں کہ معاشرہ مختلف قسم کی کشمکشوں، پریشانیوں اور افراتفریوں کا شکار ہو رہا ہے، ان میں سب سے زیادہ قابل فکر آپس کا تفرقہ، فرقہ بندی، نفس پرستی، خود غرضی اور بے غیرتی کی باتیں ہیں جن سے ملت اسلامیہ داغدار ہو رہی ہے، ان باتوں کا اثر آپس کے مسائل و تعلق پر پڑتا ہے اور ان سے چھوٹی بڑی بہت سی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔

مسلم معاشرہ ہم سب کے مجموعہ کا نام ہے، کوئی عیب اگر ہم کو اپنے کسی بھائی یا دوست میں نظر آتا ہے تو ہم کو یہ سمجھنا چاہئے کہ وہ ہم میں بھی ہو سکتا ہے، شاید شکل بدلی ہوئی ہو، دوسرے کے اندر عیب دیکھ کر عیب کو محسوس کر لینا اور اس کے ازالہ کی کوشش کرنا بڑی سمجھ کی بات ہے۔

مسلم معاشرہ کے حالات کا جائزہ لیا جائے تو اس کی خرابیوں کے بڑے اسباب میں اس دائرہ کی بہت سی برائیاں نظر آئیں گی، حالانکہ مسلم معاشرہ کو رسول

مقبول نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم سے جو تعلیمات ملی ہیں ان میں اس کی طرف بہت توجہ دلائی گئی ہے، قرآن مجید میں فرمایا گیا "إنما المومنون إخوة" اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "لن یؤمن أحدکم حتی یحب لأخیه مایحب لنفسه" اور فرمایا: "المسلم للمسلم کالبنیان یشدّ بعضه بعضاً" یعنی ایک مسلمان دوسرے مسلمان کو صرف اپنا بھائی ہی نہ سمجھے بلکہ اس کے لئے پسند بھی وہی کرے جو خود پسند کرتا ہے، ایک مسلمان دوسرے مسلمان سے ایسا تعلق پیدا کرے جیسا کہ ایک اینٹ دوسری اینٹوں کے درمیان ہوتی ہے اور ایک اینٹ دوسری اینٹ کو تھامتی اور مضبوط کرتی ہے۔

ان اصول کو سامنے رکھتے ہوئے ہم اپنے معاشرہ پر جب نظر ڈالتے ہیں تو بڑی مایوسی ہوتی ہے، ہم اس کا معاملہ تعلیمات اسلامی سے بالکل برعکس پاتے ہیں، ہم دیکھتے ہیں کہ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کو عملاً اپنے بھائی کا مقام بالکل نہیں دیتا، اور اگر بعض اثرات کی وجہ سے کسی حد تک بھائی کا مقام دیتا ہے تو اس کے مفادات کو وہ درجہ نہیں دیتا جو اپنے مفادات کو دیتا ہے، بلکہ مسلمان معاشروں میں یہ بات صاف طریقہ سے دیکھی جاسکتی ہے کہ ایک مسلمان دوسرے مسلمان سے صرف اپنے ذاتی مفاد کے دائرہ ہی میں تعلق رکھتا ہے، اگر اس کا ذاتی مفاد کا معاملہ نہ ہو تو پھر اس کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں رہتی، مال کے خریدنے بیچنے میں، اخلاق وسلوک برتنے میں، دوستی دشمنی کرنے میں، تعلقات قائم کرنے اور توڑنے میں اسلام کے مقرر کئے ہوئے اخلاق بالکل نظر نہیں آتے، رہا یہ کہ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کو اپنا بھائی سمجھے اور اس کے لئے وہی چاہے جو اپنے لئے چاہتا ہے تو اس کا تو تصور بھی مشکل ہو گیا ہے، اس کی اصل وجہ خود غرضی کا وہ چلن ہے جو غیر مسلموں سے مسلمانوں میں پوری طرح منتقل ہو گیا ہے، بلکہ غیر مسلم سے منتقل

ہونے کی کیا ضرورت خود آدمی کا نفس ہی اس کام کو انجام دے لیتا ہے، یہ نفس وہ نفس ہے جو اسلامی تعلیمات کے اثر سے بالکل بے نیاز ہو گیا ہے۔

مسلمانوں کے اندر اس خود غرضی کے پھیلنے کے بعد اس کے اثرات مسلم معاشرے کے پہلوؤں میں بہت نمایاں ہو گئے ہیں، اس خود غرضی کے اثرات اس وقت سیاسی اور اقتصادی پہلوؤں میں زیادہ نمایاں ہیں، سیاسی زندگی میں مسلمانوں کی شدید بدحالی میں اسی خود غرضی کا دخل زیادہ ہے، ہر ایک شخص قائد تو بننا پسند کرتا ہے، لیکن تابع بننے کے لئے تیار نہیں اور ظاہر ہے کہ کسی جماعت یا گروہ میں صرف ایک ہی قائد ہو سکتا ہے، اور جب کئی شخص قائد کے لئے کوشاں ہوں گے تو وہ گروہ بندی اور انتشار کا شکار ہو جائے گا، اور اس سے کمزور ہو کر دشمن سے مار کھائے گا اور کسی بھی خطرہ کے مقابلہ سے قاصر رہے گا اور یہی اس وقت مسلمانوں کی جماعتوں، انجمنوں، اداروں حتی کہ مسجدوں کی ہنگامی کمیٹیوں کی کہانی ہے کہ امام کو اپنا فریضہ اور ذمہ داری سمجھنے کے بجائے ارکان حضرات کے حکم و انتظام کو اپنا حق زیادہ سمجھنے لگے ہیں، اور پھر اس رسہ کشی میں انجمن یا ادارہ برباد ہو جاتا ہے یا ٹکڑوں میں تقسیم ہو جاتا ہے۔

یہ بات کہ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کو اپنا بھائی سمجھے اور اس کے مفادات کو وہی اہمیت دے جو اپنے مفادات کو دیتا ہے ایک خواب بن چکی ہے، جس کا علم کتابوں میں ہوتا ہے یا ذہن میں ایک دھندلا تصور لایا جا سکتا ہے، حالانکہ ایک مسلمان کا دوسرے مسلمان کو اپنا بھائی سمجھنا وہ طاقت ہے جس پر مسلمانوں کی شیرازہ بندی کا بڑی حد تک انحصار ہے، اور ملت کی تاریخ میں بے شمار کامیابیاں اسی سے پیدا ہوئی ہیں اور آج بھی کسی درجہ میں یہ تصور عمل میں آتا ہے تو وہ کامیابیاں حاصل ہونے لگتی ہیں، اور یہ وہ طاقت ثابت ہوتی ہے جس

سے دوسری ملتیں اور قومیں مسلم ملت پر رشک کرتی ہیں۔

اس بھائی چارہ میں گورے کالے کا، آقا وغلام کا، دولت مند وغریب کا، حاکم ومحکوم کا اور طاقتور وکمزور کا فرق ختم ہو جاتا ہے، جس کی مثال اس سے ملتی ہے کہ بلال حبشیؓ، صہیب رومیؓ، سلمان فارسیؓ اور ابوبکر قرشیؓ سب حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قیادت میں نہ صرف اکٹھا ہو گئے بلکہ دوست، ساتھی اور ہم پیالہ وہم نوالہ بن گئے، غلام وآقا کا فرق اٹھا تو دنیا نے یہ نمونہ بھی دیکھا کہ عظیم القدر مسلم حاکم خلیفۂ ثانی عمر فاروقؓ بیت المقدس میں عنان اقتدار سنبھالنے کے لئے داخل ہوتے ہیں اور خود پیدل ہیں اور ان کا غلام سواری پر، کیوں کہ سواری ایک تھی اور یکے بعد دیگرے اس پر بیٹھتے تھے اور شہر میں داخل ہوتے ہوئے غلام کی باری تھی لہٰذا وہ قائم رہی۔

وطنیت کا فرق اس طرح مٹایا کہ ایرانی نژاد سلمان فارسیؓ احاطہ اسلام میں داخل ہوتے ہیں اور محمد بن عبداللہ قرشی عربی فرماتے ہیں کہ "سلمان منا أهل البيت" کہ "سلمان ہم میں مثل گھر والوں کے ہیں" اور آپ حجۃ الوداع کے موقع پر ببانگ دہل اعلان فرماتے ہیں کہ عرب کو عجم پر اور عجم کو عرب پر گورے کو کالے پر اور کالے کو گورے پر کوئی برتری حاصل نہیں سوائے اس کے اس میں نیکی واحتیاط ہو، سب آدم کے بیٹے ہیں، اور آدم کی تشکیل مٹی سے ہوئی ہے" چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا لوگوں کے ساتھ معاملہ اسی کے مطابق رہا، آپ نے اپنے آزاد کردہ غلام حضرت زید بن حارثہ اور ان کے بیٹے اسامہ بن زید سے اپنے بھتیجوں اور نواسوں کی طرح شفقت کا معاملہ کیا۔

یہ وہ اخوت تھی جس نے دنیا میں ایک انقلاب برپا کر دیا، مشرق سے مغرب تک اس کے آثار ونتائج سامنے آنے لگے اور ایک ہی برادری میں ہندی و ترکی رومی وایرانی، عرب وبربر، مصری وحبشی اکٹھا ہو گئے، لیکن آج ہم پھر ٹکڑوں

میں بٹ گئے ہیں اور ہم کو اپنے رنگ و نسل پر فخر ہونے لگا ہے، پھر آپس میں مزید دوری بڑھ گئی، آج ہم ایک دوسرے کے معاملہ میں خود غرضی اور نفس پرستی کا شکار ہو چکے ہیں، اپنے فائدہ کو صرف ترجیح دیتے ہی نہیں، بلکہ اپنے مفادات کے سامنے دوسرے کے ہر طرح کے نقصان کو قبول کر لیتے ہیں، اور ہر مسلمان کا مزاج صرف اپنے مفاد پر نظر رکھنا بن چکا ہے اور ہماری ملی زندگی اسی عیب سے تار تار ہے۔

ضرورت اس وقت سب سے زیادہ اس بات کی ہے کہ ہم انفرادی مفادات کی فکر، اجتماعی مفادات کو قربان کر کے نہ کریں اور اپنے فائدہ کے حصول میں خود غرضی کا ثبوت نہ دیں، اس کے لئے بہترین اصول وہی ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سنایا کہ ''اپنے بھائی کے لئے وہی چاہیں جو اپنے لئے چاہتے ہیں'' ایک مسلمان جب دوسرے مسلمان کو اپنا بھائی سمجھے گا تو اس کے مفادات کو نقصان پہنچانا تو بڑی بات ہے، اس کا کسی طرح کا نقصان گوارا نہ کرے گا، اس کی بے عزتی اور بدنامی کو قبول نہ کرے گا، نہ خود اس کے دل کو دکھائے گا، اور نہ کسی اور کو اس کا دل دکھانے دے گا، بلکہ اس کی ترقی سے خوش ہوگا اور اس کے فائدہ کو ایک حد تک اپنا فائدہ سمجھے گا اور اگر کوئی ترشی، تلخی اتفاقاً پیدا ہو جائے گی تو اس کو نظر انداز کر دے گا، اور کسی موقع پر عداوت کے کچھ اسباب پیدا ہو جانے پر کوشش کرے گا کہ وہ اسباب اثر انداز نہ ہوں، اور اثر انداز ہو جائیں تو جلد از جلد ان کا ازالہ ہو جائے۔ اس کے کاروبار کو گرنے سے بچائے گا، اس کے سودے پر مداخلت کر کے اپنا سودا نہ شروع کر دے گا، اس کی خوشی و غم کو اپنی خوشی و غم سمجھے گا۔

یہ وہ باتیں ہیں جو کسی کو بھائی سمجھنے کی صورت میں خود بخود ظہور میں آجاتی ہیں، اور ان میں سے اکثر کا علیحدہ علیحدہ حکم بھی اللہ اور اس کے رسول کے ارشادات میں مل جاتا ہے۔

عمل صالح اور حسنِ تدبیر

مسلمان چونکہ اللہ وحدہ لاشریک لہ کے بندے کہلاتے ہیں اور وہ اس کے دعویدار بھی ہیں، انھوں نے اپنے کو مسلمان سمجھنے اور ماننے کی وجہ سے اپنے اوپر اللہ کے حکم کی تعمیل اور اس کے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی تابعداری کی پابندی قبول کر لی ہے، لہٰذا اللہ تعالیٰ کا معاملہ ان کے ساتھ اسی بنیاد پر ہوتا ہے کہ اگر وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے بتائے ہوئے طریقوں پر چلیں گے تو ان کی مدد اور نصرت ہوگی اور اگر اس کے حکموں پر نہ چلیں گے تو اللہ تعالیٰ کو ان کی پرواہ نہیں وہ جانیں اور ان کا کام۔ وہ اگر طاقت و تدبیر میں بڑھے ہوئے ہوں گے تو دنیاوی قاعدہ سے اپنے کمزور پر غالب آئیں گے اور کمزور ہوں گے تو نقصان اٹھائیں گے، مسلمانوں کے برعکس غیر مسلموں نے یہ پابندی نہیں قبول کی، وہ صرف عبادت کی بعض شکلوں کو اور اپنے دل میں کسی کی بھی بندگی کا احساس کر لینے کو کافی سمجھ لیتے ہیں، ان کا جرم اللہ وحدہ کے ساتھ شرک کا اور عقیدہ باطلہ کا ہے جس کی سزا عموماً اس دنیا میں نہیں دی جاتی ہے اور نہ ان کو اس جرم کی بنیاد پر دنیا کے فائدوں سے محروم کیا جاتا ہے، بلکہ مسلمانوں کے برعکس ان کو دنیا کے فائدے اٹھانے کا زیادہ موقع دیا جاتا ہے کیونکہ آخرت میں ان کو کچھ نہیں ملے گا مسلمان اگر دنیا کے

فائدے سے محروم رہتا ہے تو اس کو آخرت میں ملتا ہے۔

لیکن جب مسلمان اس دنیا میں اپنے رب کے احکام صحیح طور پر بجالاتے ہیں تو اللہ کی طرف سے ان کی نصرت اس دنیا میں ہوتی ہے اور اگر انھوں نے تابعداری کے معیار کو پورا کیا تو ان کی خاطر ان کے دشمنوں کو اس دنیا میں سزا بھی دے دی جاتی ہے، مسلمانوں کو اپنے پروردگار کی نصرت و مدد حاصل کرنے کے لیے اپنے کو باعمل بنانا ضروری ہے، باعمل بننے کے بعد پھر دنیا کی کوئی طاقت ان کو روک نہیں سکتی، تاریخ اسلامی میں ایسے ایسے واقعات پیش آئے ہیں کہ ایمان و عمل میں کامل لوگوں کی نصرت کی خاطر حقائق تک بدل دیئے گئے اور مقررہ اصول میں تبدیلی کر دی گئی اور خدا نے اپنے بندوں کی نصرت کی خدا کی نصرت کا جب فیصلہ ہو جاتا ہے تو حیرت ناک نتیجے سامنے آتے ہیں۔

بہر حال اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی کیفیت کو دیکھتا ہے، کہ انھوں نے اپنی ذمہ داری پوری کر دی یا نہیں یعنی ایمان و عمل صالح کا جو معیار مقرر ہے وہ ٹھیک رہا ہے یا نہیں، دوسرے یہ کہ جو تدابیر ان کے اختیار میں ہیں وہ پوری کی گئی ہیں یا نہیں اس سلسلہ میں جنگ بدر و جنگ احد اور دیگر جنگوں سے سبق ملتا ہے، اس سلسلہ میں خاص طور پر غزوہ خندق کی مثال بہت فکر انگیز ہے جہاں بطور تدبیر اولا شہر کے ایک سمت ایک وسیع و گہری خندق کھود کر مسلمانوں نے اپنے اور دشمن کے درمیان رکاوٹ قائم کی، پھر خندق کی نسبتاً کمزور جگہوں پر اپنے فوجی دستے لگائے تاکہ اپنے کو مضبوط و محفوظ بنایا جا سکے اور اس کے ذریعہ دشمنوں کو جو بہت بڑی جمعیت لے کر آئے تھے اور کئی قبائل کی مدد سے بڑی فوج تیار کی تھی خندق کے دوسری طرف محدود رکھتے ہوئے اس سے نبرد آزمائی کی جائے، اس کے لیے ان کو طویل و عریض خندق کھودنے کی مشقت جھیلنی پڑی پھر شدید جاڑے اور غذا کی

قلت کا زمانہ تھا، اس کو جھیلتے ہوئے نہ صرف یہ کہ خندق کھودی، بلکہ تقریباً تئیس روز رات و دن اس خندق کی حفاظت کی اور خندق کے دوسری طرف پڑے ہوئے عظیم لشکر سے نبرآزمائی کے لیے ہر وقت مستعد و تیار رہے، راتوں میں سخت سردی کھاتے، دن میں عموماً بھوکے رہتے، لیکن اپنے مقصد کار میں کوتاہی نہیں کرتے تھے، بلکہ پہلے دن کے جیسے جذبہ کو قائم رکھتے رہے، وہ اس طول طویل مشقت سے ہمت نہیں ہارے اور نہ تدبیر پر اعتراض کیا کیونکہ وہ خودرائی میں نہیں لڑ رہے تھے، بلکہ اپنے پروردگار کے احکام کی تعمیل کر رہے تھے، اس لیے اپنی پسند اور خواہش اور خودرائی سے بلند ہو کر اپنے جذبۂ جہاد کا ثبوت دے رہے تھے، ان کو حکم ہوا تھا کہ خندق کھودو، اس کے نیچے سے مقابلہ کرو اور گھر بار چھوڑ کر خندق کے پاس شب و روز رہو اور جو پڑے اس کو جھیلو، ایک ہفتہ گزرا دو گزرے تیسرا بھی گزر گیا، اور سب مشقت جھیلتے ہوئے یقین و قربانی کے جذبہ سے سرشار دشمن کے سامنے جمے رہے، اس طرح انھوں نے ایمان و یقین کے معیار کو بھی ثابت کر دیا اور تدبیر و حکمت عملی کے تقاضہ کو بھی پورا کر دیا، جب انھوں نے اپنی ذمہ داری پوری کر دی تو اللہ تعالیٰ نے بغیر لڑے کامیابی دے دی، سخت آندھی آئی دشمن کے کیمپ اور خیمے سب اکھڑ گئے اندر کا سامان اڑنے لگا جس نے خوف و ہراس سے دشمن کے دل بھر دیئے، مزید یہ کہ تین ہفتوں سے زائد کھلے میدان میں جنگ کی مشقت جھیلنے نے دشمن کی برداشت بھی ختم کر دی تھی، لہٰذا وہ سامان چھوڑ کر بری طرح بھاگ کھڑا ہوا اور دیکھتے دیکھتے فتح مبین مسلمانوں کو حاصل ہو گئی اور پھر صرف اس فتح پر ہی بات ختم نہیں ہوئی، بلکہ ان کے قرب و جوار کے مخالفوں کے دلوں میں بھی رعب پیدا ہو گیا، ان میں سے بعض دشمنوں نے خود سے ہتھیار ڈال دیئے اور اپنے بارے میں خود مسلمانوں کا فیصلہ مان لینے کا اعلان

کر دیا۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں اس واقعہ کو ایک صبر آزما اور ایمان و یقین کا امتحان لینے والا واقعہ بتایا ہے، فرمایا کہ دیکھو ہم نے پھر کیسی مدد کی یہ دشمن بھی بھاگا اور دشمن بھی زیر ہوا جس سے مقابلہ کے لیے تم تیار نہیں ہوئے تھے۔

اللہ تعالیٰ نے اس واقعہ کا ذکر اس طرح فرمایا:

کہ اے ایمان والو! یاد کرو اللہ کے احسان کو جو تم پر ہوا، جبکہ دشمن کی فوجیں تم پر حملہ آور ہوئی تھیں ہم نے ان پر ہوا بھیجی اور ایسی فوج بھی بھیجی جس کو تم نے دیکھا نہیں، اللہ تعالیٰ تمہارے عمل پر نظر رکھنے والا ہے، دشمن کی فوجیں تم پر چڑھ آئی تھیں اوپر سے نیچے سے اس سے تمہاری حالت ایسی ہوگئی تھی کہ آنکھیں پتھرا گئی تھیں اور کلیجے منہ کو آ گئے تھے، اللہ کی مدد آنے کے بارے میں تم کو طرح طرح کے خیالات آنے لگے تھے، واقعی اس وقت ایمان والوں کی سخت آزمائش ہوگئی تھی اور وہ جھنجھوڑ کر رکھ دیے گئے تھے۔

﴿يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اذْكُرُوا نِعْمَةَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ جَاءَتْكُمْ جُنُودٌ فَأَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيحًا وَجُنُودًا لَمْ تَرَوْهَا وَكَانَ اللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرًا ○ إِذْ جَاءُوكُمْ مِنْ فَوْقِكُمْ وَمِنْ أَسْفَلَ مِنْكُمْ وَإِذْ زَاغَتِ الْأَبْصَارُ وَبَلَغَتِ الْقُلُوبُ الْحَنَاجِرَ وَتَظُنُّونَ بِاللَّهِ الظُّنُونَا ○ هُنَالِكَ ابْتُلِيَ الْمُؤْمِنُونَ وَزُلْزِلُوا زِلْزَالًا شَدِيدًا﴾

(سورۃ الاحزاب)

اس کے تذکرہ کے بعد اللہ تعالیٰ نے مختلف طبائع کے احساسات و معاملات کا نقشہ کھینچا ہے، پھر آخر میں فرمایا کہ پھر اللہ تعالیٰ نے ان کفار کو ان کے غصہ کے ساتھ واپس کیا، کچھ بھی بھلائی ان کے ہاتھ نہیں آئی اور اللہ تعالیٰ نے اصحاب ایمان کو جنگ سے بھی بچالیا، اللہ تعالیٰ قوی اور غالب ہے، اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو بھی جنھوں نے ان فوجوں کو مدد پہنچائی تھی یعنی اہل کتاب کافروں کو ان کے قلعوں سے نکالا، اور ان کے دلوں میں رعب و دبدبہ ڈال دیا ان میں سے ایک جماعت کو تم قتل کر رہے تھے اور ایک جماعت کو گرفتار کر رہے تھے، اور ان کی زمینوں، مکان اور مال و متاع کا تم کو مالک بنا دیا اور ایسی زمینوں کا بھی مالک بنا دیا جہاں تم کو فوج لے کر جانا بھی نہیں پڑا، بلاشبہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے:

﴿وَرَدَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِغَيْظِهِمْ لَمْ يَنَالُوْا خَيْرًا وَكَفَى اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ الْقِتَالَ وَكَانَ اللّٰهُ قَوِيًّا عَزِيْزًا ○ وَاَنْزَلَ الَّذِيْنَ ظَهَرُوْهُمْ مِنْ اَهْلِ الْكِتَابِ مِنْ صَيَاصِيْهِمْ وَقَذَفَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الرُّعْبَ فَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ وَتَاْسِرُوْنَ فَرِيْقًا ○ وَاَوْرَثَكُمْ اَرْضَهُمْ وَدِيَارَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ وَاَرْضًا لَّمْ تَطَئُوْهَا وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرًا﴾۔

(سورۃ الاحزاب: ۲۵، ۲۶، ۲۷)

ہم کو غزوہ خندق سے کئی سبق ملتے ہیں، ایک تو بہتر سے بہتر تدبیر کا اختیار کرنا اور تدبیر کا انتخاب امیر کی طرف سے ہو جانے پر سب کا بے چوں و چرا اس پر عمل کرنا خواہ پریشانی، تکلیف، بھوک اور تحمل کا کیسا بھی امتحان ہو جائے اس وقت خندق کھودنے کا عمل جنگ کی بہتر سے بہتر تدبیر تھی اس وقت تک عربوں نے دشمن کے سامنے روک کھڑی کرنے کی یہ تدبیر سوچی نہیں تھی، یہ ایرانی شہنشاہوں کی حربی

تدابیر میں شامل تھا جس کا مشورہ حضرت سلمان فارسیؓ نے دیا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو قبول فرمایا، پھر اس کو کھودنے کے لیے سارے مسلمان مزدوروں کی طرح دن رات لگ گئے اور ایک عظیم خندق کھودی جو بظاہر ان کی صلاحیت کار سے بہت زیادہ تھی پھر سب مل کر اس پر پہرہ دیتے رہے اور ہمہ وقت مقابلہ کے لیے تیار کھڑے رہے، ان کے ایمان و یقین کا زبردست امتحان تھا، دشمن نے اپنی بڑی جمعیت اور قبائلی تنوع کے ساتھ ایک پر ہیبت طاقت لا ڈالی تھی جس نے اچھے اچھے لوگوں کے دل دہلا دیئے تھے اور خوف و پریشانی کی فضا پیدا کر دی تھی جو ایک روز دو روز کی نہ تھی وہ فضا تین ہفتہ سے زیادہ تک قائم رہی، اور مسلمان اللہ تعالیٰ کی مدد کا انتظار ہر روز کرتے اور امید قائم رکھتے، وقت گزرتا رہا اور صبر کا امتحان ہوتا رہا، لیکن ایمان والے تین ہفتہ امید و بیم کی جیسی کیفیت میں قائم و ثابت قدم رہے اور ایمان و یقین میں سچے نکلے چنانچہ ان کو بغیر لڑے فتح دے دی گئی ان کو فتح جس طرح عطاء کی گئی اس طرح وہ پہلے دن ہی دی جا سکتی تھی یعنی اللہ تبارک وتعالیٰ پہلے دن وہ آندھی بھیج سکتا تھا جس نے بغیر لڑے دشمنوں کے پیر اکھاڑ دیئے، پہلے روز نہ سہی دو چار روز بعد بھیج سکتا تھا، لیکن جتنے بڑے درجہ کے ایمان والے تھے اتنا بڑا ان کا امتحان ہوا، ان کو ایمان و تدبیر دونوں کا معیار قائم کرنا پڑا۔

غزوۂ خندق میں مسلمانوں کے ایمان و یقین کے ثابت ہونے کے ساتھ ان کی قیادت کی طرف سے تدبر و حکمت عملی کا بھی بہتر سے بہتر انتخاب ہوا جس کو دیکھ کر دشمن بھی حیران تھے، انہوں نے اپنی جنگوں میں ایسا نہیں دیکھا تھا، مسلمانوں کے دلوں میں بھی یہ ایک قوت کی کیفیت بنی ہوگی کہ یہ تدبیر تو بہت شاندار ہے اس کو اختیار کرنا اور حکم دینا بہت مناسب ہے اور اس پر عمل سے اچھے نتائج کی توقع کی جا سکتی ہے اگرچہ اس نے بہت طول کھینچا اور صبر کا امتحان ہوا اس

سے قدرے مختلف صورت مسلمانوں کو ایک دوسرے موقع پر پیش آئی وہ موقع صلح حدیبیہ کا ہے، صلح حدیبیہ کے موقع پر ایمان و یقین کا ثبوت دینے کے ساتھ مسلمانوں نے اس بات کا بھی مکمل ثبوت دیا کہ اللہ کا نبی کوئی ایسی بات سوچتا اور طے کرتا ہے جو بالکل سمجھ میں نہیں آتی اور جس میں بظاہر سخت بے عزتی کا رنگ پایا جاتا ہے تو چونکہ وہ اللہ کا نبی ہے ہم کو اس کی بات ہر حال میں ماننا ہے، اس لیے اپنے دل دبا کر وہی کرنا ہے جو اس کی طرف سے کہا جا رہا ہے، اور اگرچہ اس تدبیر میں کوئی حکمت عملی اور افادیت نظر نہیں آتی، لیکن اللہ کو جب یہی منظور ہے تو یہی بہتر ہوگا، چنانچہ اصحاب ایمان وہاں بھی کامیاب نکلے اور نبی کی اطاعت جس میں اپنے امیر پر اعتماد کرنے کی کیفیت بھی مضمر تھی اعلیٰ معیار سے پوری کی پھر انہوں نے فائدہ دیکھ لیا کہ وہ صلح جو بظاہر شکست کے مرادف تھی کیسی عظیم فتح کا فائدہ دے گئی۔ اس نے ایک طرف تو غیر معمولی طور پر دعوتی فائدہ پہنچایا کہ دو سال کے اندر اتنے لوگ مسلمان ہوئے کہ اس سے قبل ۱۸ سال کی کوششوں سے اتنے مسلمان نہیں ہوئے تھے، دوسری طرف اس کے نتیجہ میں مکہ جیسا شہر جو مسلمانوں اور کافروں دونوں کی نظر میں پورے عرب کا مرکز اور دل سمجھا جاتا تھا بلا جنگ کے فتح ہو گیا۔ اس لیے قرآن مجید نے صلح حدیبیہ کو جس کو بادی النظر میں شکست کے مرادف سمجھا جاتا تھا فتح مبین قرار دیا جس کا تذکرہ اسی سورہ میں ہے جس کا نام بھی سورہ فتح قرار دیا گیا ہے۔

عزم و ہمت اور عملِ پیہم

رہبر عالم سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے امت مسلمہ کی قیادت کی باگ ڈور ایسے نازک ترین اور پر آشوب دور میں سنبھالی تھی جب کہ یہ لازوال امت ساز و سامان سے محروم، نیز اس کے حصول کے وسائل سے تہی دامن تھی، لیکن دوسری طرف اس زندہ جاوید امت کو قادر مطلق نے فطرت انسانی کی قوت اور عملی صلاحیت کی وہ شاہ کلید عطاء کی تھی جو فولادی طاقتوں سے بھی عظیم تر طاقت تھی، اس کے برخلاف فارس و روم اور آس پاس کے دیگر ممالک کو وہ تمام مادی اور ظاہری وسائل مہیا تھے جو آج بھی قوت و طاقت کا راز سمجھے جاتے ہیں، لیکن جب اسلام جیسی عظیم قوت کا سامنا ہوا تو باطل طاقتوں کے دلفریب قلعے ریت کی دیوار کی طرح زمین بوس ہو گئے اور مسلمانوں نے اپنی باہری ساز و سامان کی کم مائیگی علوم و فنون اور تہذیب و تمدن کی تہی دامنی کے باوجود بڑے سے بڑے باطل کے آہنی قلعوں کو مسمار کر دیا اور مادہ پرستوں کی حیرت انگیز شان و شوکت کا مکمل خاتمہ کر دیا، یہ ایک سبق آموز امر ہے کہ روم و ایران مادیت کے مہلک مرض کینسر کا شکار اور میدان عمل میں ایسے اپاہج ہو گئے تھے جو ان کے لیے حقیقت میں پیغام موت تھا۔

یہیں سے یہ حقیقت روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ ان صحرا نشینوں

کی کامرانی اور روم وایران جیسے متمدن ملک کی شکست، علوم وفنون سے نا آشنا شتر بانوں کی فتح اور علوم وفنون سے مالا مال مادہ پرستوں کی ناکامی کا راز، مسحور کن تہذیب وتمدن کی ترقی اور عیش وتنعم کے وسائل کی فراوانی میں مضمر نہیں، بلکہ حقیقی قوت عزم وہمت اور عمل پیہم میں تھی ہے جس سے انکار کرنا زندگی کی کشتی کو طوفانی بھنور میں ڈھکیل دینے کے مترادف ہوگا۔

یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ آج کی پرفریب تہذیب کی چمک دمک نے ساری دنیا کے بنی نوع انسان کے چین وسکون کو درہم برہم کر دیا ہے اور ہلاکت کے ایسے دہانے پر پہنچا دیا ہے جہاں موت کھڑی انتظار کر رہی ہے۔ آج کی یہ نام نہاد متمدن قومیں اور مشینی انسان خود فریبی میں مبتلا ہیں کہ یہ بھیانک تہذیب اسے ہلاکت سے بچالے گی۔ اور انسانیت کی ڈوبتی کشتی کو ساحل نجات پر پہنچا دے گی، لیکن کاش یہ حقیقت ہوتی، یہ کوئی خیالی بات نہیں بلکہ ایک ٹھوس حقیقت ہے، تاریخ شاہد ہے کہ آج سے صدیوں پہلے مسلمان اور عرب کی تہذیب وتمدن کے باغ میں بہاروں کا شباب تھا۔ مسلمانوں کے علوم وفنون کا دور دورہ تھا۔ اور ساری دنیا کو مسلمانوں کی طاقت کے سامنے جھکنا پڑا تھا، لیکن چشم فلک نے بعد میں یہ بھی دیکھا ہے کہ ان کی تہذیب وتمدن، علوم وفنون اور مادی طاقتیں انھیں خونخوار تاتاریوں کی وحشیانہ یورشوں سے نہیں بچا سکیں اور دیکھتے ہی دیکھتے عروس البلاد شہر بغداد جو علوم وفنون اور تہذیب وتمدن کا روشن مینارہ سمجھا جاتا تھا ویران وبرباد ہو گیا اور اس کا پر بہار چمن اس طرح خزاں کی نذر ہو گیا کہ دوبارہ اس کی بہار نہیں لوٹ سکی

اس کے علاوہ بہت سے ایسے سبق آموز واقعات ہیں جو اس حقیقت کی نشاندہی کرتے ہیں کہ صرف تہذیب وتمدن کی چمک دمک علوم وفنون کی نیرنگیاں اور گزشتہ تاریخ کی شان وشوکت بنی نوع انسان کو حقیقی کامرانی سے ہم کنار نہیں کر سکتی

تاوقتیکہ اس کا دل و دماغ، عزم و ہمت، اخلاص و عمل، وسیع النظری اور بلند کرداری سے سرشار نہ ہو، افسوس کہ آج اہل مشرق ظاہری محاسن اور پرفریب تہذیب کی چمک دمک سے اس طرح مرعوب نظر آتے ہیں کہ موجودہ دولت کی ریس والی ذہنیت نے انھیں اعلیٰ اور صحت مند اقدار سے محروم کر دیا ہے۔

جہاں تک ترقی یافتہ ممالک کا تعلق ہے تو ان کی ساری صلاحیتیں ان مادی علوم کے حصول میں صرف ہو رہی ہیں جو ان کی زندگی کے تقاضوں کو پورا کر سکیں، اس کے برخلاف ترقی یافتہ ممالک اپنی ساری صلاحیت یا تو تہذیب کی ظاہری چمک دمک کے حصول میں صرف کر رہے ہیں یا پھر ہاتھ پر ہاتھ دھرے منتظر فردا ہیں، حالانکہ ترقی ثقافتی ادبی اور فکری اعتبار سے مغرب کی قطعاً محتاج نہیں، جبکہ یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ مستعار تہذیب کسی طرح بھی سودمند نہیں ہو سکتی ہے۔ اقوام مشرق خصوصاً امت مسلمہ کامیابی سے اس وقت ہم کنار ہو سکتی ہے جبکہ معنوی قوت کے ساتھ ساتھ ''الحکمة ضالة المومن فاین وجدها فهو احق بها'' کے پیش نظر موجودہ ترقی یافتہ قوموں سے ایسے تجربات حاصل کرے جو کسی بھی ترقی پذیر قوم کے لیے ضروری ہو سکتے ہوں۔

آج ہم ٹیکنکل اقتصادی اور سیاسی میدان میں مغرب سے بہت پیچھے ہیں اس کا واحد سبب یہ ہے کہ ہم نے عملی قدم اس عزم و ہمت کے ساتھ نہیں اٹھایا جو کسی بھی ترقی پذیر قوم کے لیے ضروری ہے۔ جب تک ہم اخلاص و مروت، عزم و ہمت، اخلاقی اقدار اور بلند کرداری کا نمونہ دنیا والوں کے سامنے پیش نہیں کریں گے تب تک ہم نہ ترقی کے کٹھن دشوار گزار اور ناہموار راستے کو طے کر سکتے ہیں اور نہ اعلیٰ مقاصد کی تکمیل سے ہم کنار ہو سکتے ہیں۔ آج مسلمانوں نے اپنی غیر ذمہ دارانہ اور بے مقصد زندگی ثقافتی اور فکری کم مائیگی کے باعث اپنے مستقبل کی

گاڑی کو ایسے بھیانک ڈگر پر ڈال دیا ہے جو کسی وقت بھی ہلاکت کی گہری کھائی میں گر سکتی ہے۔ لہٰذا رہنمایان ملت اور رہبران قوم پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ خود غرضی اور موقع پرستی کی پستیوں سے بلند ہو کر اس امت کو ہلاکت کی کھائیوں میں گرنے سے بچائیں کہیں ایسا نہ ہو کہ اپنے دشمنوں کے دام فریب میں آ کر ہمیشہ ہمیش کے لیے اپنی انفرادیت کھو بیٹھیں۔

خودرائی، غیبت اور جھوٹ
معاشرہ کے تباہ کن روگ

یہ امت جو وحدت و اتفاق کی صفت پر قائم ہوئی افسوس ہے کہ سب سے زیادہ اسی صفت سے محروم ہے، اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ اس میں مقصد اور رضائے الٰہی سے وہ وابستگی نہیں جو ہر شخص کو اپنی ذات اور ذاتی مصلحت سے ہوتی ہے، اسی سے خودغرضی اور خودرائی کو تقویت ملتی ہے، حالانکہ خودرائی "إعجاب کل ذی رأی برأیہ" پر حدیث شریف میں بڑی نکیر فرمائی گئی ہے اور فرمایا گیا ہے کہ جب یہ صورت ہو تو قیامت قریب سمجھو۔ خودغرضی وہ مرض ہے جس کا اسلام سے کوئی جوڑ نہیں اس کو تو "أن یحب لأخیہ ما یحب لنفسہ" کہہ کر بالکل ختم کر دیا گیا ہے، یعنی فرمایا گیا ہے کہ مسلمان اس وقت تک مومن نہیں جب تک اپنے بھائی کے لیے وہی نہ پسند کرے جو اپنے لیے پسند کرتا ہے۔ اب ہم ذرا اپنی زندگی کا جائزہ لے کر دیکھیں کہ کیا ہم میں یہ صفت کچھ بھی باقی ہے، کیا ہم اپنے مسلمان بھائی کے مصالح کا ویسا ہی خیال کرتے ہیں؟ کیا ہم اس کو نقصان سے محفوظ رکھنے کی فکر ویسی ہی کرتے ہیں جیسی فکر اپنے لیے کرتے ہیں؟ اگر اس کا جائزہ لیا جائے تو ہم کو بڑی مایوسی ہوگی۔

خودرائی میں ہمارا موجودہ معاشرہ بری طرح مبتلا ہے وہ "اعجاب کل ذی رأی برأیہ" کا پوری طرح شکار ہے، اس کے نتیجہ میں ہماری ملی اجتماعیت پراگندگی کا شکار ہے، ہم میں سے چار آدمی بھی مل جل کر زیادہ دنوں تک کام نہیں کر پاتے، ذرا اختلاف رائے یا مصلحتوں کا ٹکراؤ پیدا ہو تو کشمکش اور افتراق کا شکار ہو جاتے ہیں، پھر مسئلہ صرف افتراق وانشقاق پر ہی ختم نہیں ہوتا، بلکہ ایک دوسرے سے ناگواری اور عداوت کی منزل تک بات پہنچ جاتی ہے اور انتقام کا جذبہ کام کرنے لگتا ہے کہ فلاں نے میری رائے نہیں مانی یا میری رائے پر نہیں چلا، یا وہ میری رائے سے اتفاق نہیں رکھتا، لہٰذا اب اس کا ساتھ نہیں ہوسکتا، بلکہ وہ قابل تعزیر بھی ہے اور تعزیر کے لیے موجودہ جمہوری دور میں غیبت اور مخالفانہ پروپگنڈہ سے لے کر عدالتی کارروائی تک کی جاتی ہے، ہمارے ملی ادارے اور کام اسی ٹکراؤ اور ہنگامہ آرائی کے شکار ہیں، حالانکہ دوسرے کی رائے کے لحاظ واحترام کی شاندار مثالیں ہم کو عہد اول میں خوب ملتی ہیں۔

غزوہ احد میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مشورہ فرمایا کہ کفار کا مقابلہ شہر سے باہر نکل کر کیا جائے یا شہر کے اندر رہتے ہوئے کیا جائے، خود حضور ﷺ کی رائے شہر کے اندر رہ کر مقابلہ کرنے کی تھی، لیکن متعدد صحابہ کرام نے اس پر زیادہ زور دیا کہ شہر سے نکل کر مقابلہ کیا جائے، اس کے نتیجہ میں حضور ﷺ راضی ہو گئے اور تیاری فرما کر نکلنے کے لیے آئے، اسی دوران صحابہ کو تاسف ہوا کہ ہم کو اس قدر اصرار نہ کرنا چاہئے تھا، آپ امیر بھی ہیں اور نبی بھی، اللہ تعالیٰ کی طرف سے رہنمائی ہوتی رہتی ہے لہٰذا وہ معذرت کرنے لگے، اور کہنے لگے کہ حضور ﷺ آپ اپنے انشراح پر عمل فرمائیں آپؐ نے فرمایا کہ اب نہیں کیونکہ نبی کے لیے مناسب نہیں کہ جب وہ فیصلہ اور تیاری کر لے تو اس سے پیچھے ہٹ جائے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم دوسروں کی رائے کا اتنا خیال کرتے تھے، لیکن آپ کا مشورہ ماننے کا یہ عمل اس وقت ہوا کرتا تھا جب وحی الٰہی

کے ذریعہ کوئی بات معین نہ کردی گئی ہو چنانچہ صلح حدیبیہ کے موقع پر تمام صحابہ مختلف رائے رکھتے تھے لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں مانا کیونکہ آپؐ نے خدائی اشارہ محسوس کرلیا تھا اور پھر جب آپ نے سب کی رائے کے خلاف کیا وہ ایسے مطیع تھے کہ انھوں نے کامل اطاعت سے اس کو مانا، صحابہ کرام کی ایسی تربیت ہوئی تھی کہ وہ اپنے امیر کو مشورہ تو پوری آزادی سے دیتے تھے لیکن امیر کے فیصلہ کردینے کے بعد اس کے فیصلہ اور حکم کا مکمل خیال رکھتے تھے اسی لیے ان کی اجتماعیت بے مثال تھی، عہد اول میں اس کی بے شمار مثالیں ملتی ہیں۔

لیکن آج مسلمانوں نے اس نمونہ کو بالکل ترک کردیا ہے، ان میں سے ہر شخص اپنی رائے کو آخری حد تک عاقلانہ اور اپنی رائے سے مخالف رائے کو احمقانہ و جاہلانہ سمجھتا ہے، حالانکہ کسی رائے کی صحت کتاب وسنت سے ثابت نہ ہوئی ہو تو اس کو کامل حق کا درجہ دینا صحیح نہیں ہے اور جب اپنی ذاتی وانفرادی فہم اور مطالعہ سے نتیجہ نکالا گیا ہو تو اس میں اپنی غلطی کا احتمال اور دوسرے کی رائے میں صحیح کا احتمال ماننا چاہیے، افسوس ہے کہ اس انتہا پسندی میں بہت سے دین دار بھی مبتلا ہو جاتے ہیں اور پھر ملت میں افتراق وانشقاق کا ذریعہ بنتے ہیں، مسلمانوں کے فقہی مذاہب اور خالص مذہبی معاملات میں بھی اختلاف رائے کا بعض وقت یہی رویہ کارفرما ہو جاتا ہے، چنانچہ حنفی شافعی کے ساتھ اور شافعی حنفی کے ساتھ اور ایک دینی نقطۂ نظر رکھنے والا دوسرے دینی نقطۂ نظر رکھنے والوں کے ساتھ بعض وقت یہی رویہ اختیار کرلیتا ہے، وہ طے شدہ فقہی اصول کی بنیاد پر زبان سے تو یہی کہتا ہے کہ چاروں مذاہب فقہیہ اور اجتہادی وقیاسی بنیاد پر قائم کردہ رائیں اپنی اپنی جگہ پر حق ہیں، ان میں سے کسی پر بھی چلنے والا باطل پر نہیں ہے، لیکن اپنے مذہب کو قطعی طور پر صحیح اور دوسرے مذاہب کو قطعی طور پر خلاف حق سمجھتا ہے اور پھر بعض وقت ایسی لڑائیاں لڑتا ہے کہ کیا دو دشمن لڑیں گے، یہ بہت

رنج وافسوس کی بات ہے، حالانکہ ایک مسلمان کا دوسرے مسلمان کی فہم ورائے کو اپنی فہم ورائے کے قریب سمجھتے ہوئے اس کے ساتھ رواداری اور لحاظ کا رویہ اختیار کرنا دینی لحاظ سے بھی اچھی بات ہے اور ملت کی اجتماعیت بھی اسی میں ہے، اگر دینی بنیاد پر نہ ہو تو اہل دنیا کے اصول سے بھی ایسا کرنا مناسب اور ضروری ہے کیونکہ اگر اپنی اجتماعیت قائم رکھنا اور بچانا ہے تو اس پر عمل کرنا ہوگا، چنانچہ مغربی زندگی میں اس کا بڑا لحاظ کیا جاتا ہے وہ نہ تو اللہ کے لیے ایسا کرتے ہیں اور نہ انسانی قدروں پر عمل کرنے کی غرض سے کرتے ہیں، ان کو ان باتوں پر یقین نہیں ہے لیکن وہ اپنی اجتماعیت کی حفاظت کی خاطر ایسا کرنے پر مجبور ہیں اور اگر وہ افتراق سے کام لیں گے تو دوسرے افراد بھی ایسا ہی کریں گے، اور پھر کوئی مسئلہ نہ طے ہو سکے گا اور نہ عمل میں آسکے گا، لہذا انھوں نے اکثریت واقلیت کے اصول کو اپنا لیا ہے اور اس پر عملدرآمد پوری رواداری سے کرتے ہیں ان کے اقلیت میں رہنے والے بالکل برا نہیں مانتے، لیکن ملت اسلامیہ کے افراد افسوس ہے کہ اقلیت واکثریت تو بڑی چیز ہے اگر کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کے خلاف ہو تو بھی تاویل کریں گے لیکن مانیں گے نہیں، یہی وجہ ہے کہ ملت اسلامیہ اس وقت سخت انتشار اور زوال وانحطاط کی حالت میں ہے۔

اگر ہم مسلمان صرف دو باتوں کی پابندی کر سکیں تو ہمارے اس اجتماعی انتشار وافتراق کا سد باب ہو سکتا ہے، ایک تو یہ کہ امیر و مامور کے جو احکام ہیں ان پر عمل کریں، ہم اپنے کسی بھی اجتماعی نظام میں خواہ وہ جماعت ہو، انجمن ہو، ادارہ ہو یا خاندان ہو، اپنے میں سے کسی ایک کو امیر کی حیثیت دیدیں پھر اس کے مامور ہونے کا حق ادا کریں، اس کے خلاف رویہ صرف اسی اصول پر اختیار کریں جو شریعت میں بتایا گیا ہے اور ہم کو یہ جاننا چاہئے کہ اسلام میں بڑے سے بڑا اور چھوٹے سے چھوٹا ہر اجتماعی نظام امیر و مامور کے اصول پر قائم ہے اور امیر و مامور

کے قاعدے شریعت نے واضح بھی کر دیئے ہیں۔

دوسری بات یہ اختیار کرنے کی ہے کہ غیبت سے پوری طرح پرہیز کیا جائے کہ جس سے ہمارا معاشرہ پوری طرح داغدار ہے، ہم میں سے ہر شخص ذرا بھی اپنی رائے یا مرضی کے خلاف کوئی بات دیکھتا ہے تو غیبت و مذمت سے اپنے ماحول کو بھر دیتا ہے، اس میں وہ نہ تو امیر و مامور کے اصول کا خیال کرتا ہے اور نہ دوستی و رفاقت کے تقاضوں کا لحاظ کرتا ہے اور نہ اخوت و محبت کے روابط کی پرواہ کرتا ہے، افسوس ہے کہ یہ صورت حال ہمارے معاشرے میں بہت عام ہے اور کھلے طریقے سے دیکھی جاسکتی ہے اور غیبت تو غیبت بے تکلف بہتان طرازی پر اتر آتا ہے، حضور اکرم ﷺ سے ایک صاحب نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ کیا ایسی برائی بیان کرنا بھی جو اس شخص میں پائی جاتی ہے غیبت ہے حضور ﷺ نے فرمایا کہ تبھی تو غیبت ہے۔ اگر اس میں نہیں پائی جاتی ہے تو اس کو کہنا بہتان ہے، ہم کو دیکھنا چاہئے کہ ہم ذرا بھی ناپسندیدگی کی صورت ہو تو کس قدر غیبت اور کس قدر بہتان طرازی کے مرتکب ہو جاتے ہیں، بلکہ ہمارے معاشرہ کے بکثرت افراد کے طرز عمل میں متعدد ایسی خصوصیت بآسانی دیکھی جاسکتی ہیں جن کو حدیث شریف میں منافق کی علامتوں میں شمار کیا گیا ہے کہ "إذا حدث كذب وإذا وعد أخلف وإذا أؤتمن خان" اور بعض روایت میں ہے کہ "وإذا خاصم فجر" کہ بات کرے تو جھوٹ بولے، وعدہ کرے تو پورا نہ کرے، امانت رکھائی جائے تو خیانت کرے اور مخاصمت ہو جائے تو گالی گلوچ کرنے لگے اور ہم کو جاننا چاہئے کہ منافق وہ شخص ہے جس کو کافر سے بھی بدتر بتایا گیا ہے، اللہ تعالیٰ ہم میں سے ہر شخص کو ان باتوں سے بچائے، ضرورت ہے کہ ہم میں سے ہر فرد ان باتوں پر کبھی کبھی غور کر لیا کرے اور ان میں سے جو برائیاں عمل میں داخل ہو گئی ہیں ان کو دور کرنے کی کوشش کرے ہماری یہ کوشش اپنے مسلم معاشرہ کو سدھارنے کے لیے ایک نہایت مؤثر قدم ثابت ہوگی۔

معاشرہ میں

اسلامی نظام اقتصادیات کی تطبیق کی ضرورت

اسلام کے ذہن میں اور موجودہ مغربی ذہن میں معاشیات کے متعلق بہت بیّن فرق ہے، اگرچہ اسلام میں بھی زندگی گزارنے کے لیے جتنی فکر کی ضرورت ہے، اس کو انجام دینے کی تاکید ہے، اور اس کی دو مثالیں نمایاں ہیں: ایک تو یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک طالب حاجت کو اس کے گھر کے پیالے کو منگوا کر نیلام کر کے ایک درہم اس کو اپنی ضروریات پوری کرنے کے لیے دیا اور دوسرے درہم میں کلہاڑی خرید کر اپنے دست مبارک سے دستہ لگایا اور کہا کہ لکڑی کاٹو اور بیچو اور اس سے کام چلاؤ، دوسرے حج کے موقع پر ایک صحابیؓ نے پیشکش کی کہ وہ اپنی ساری ملکیت اللہ کی راہ میں دے دیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا، انھوں نے کہا نصف دے دیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے بھی منع فرمایا، انھوں نے کہا کہ ثلث دے دیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ثلث بھی بہت ہے، لیکن کر سکتے ہو، اور دیکھو اپنے بچوں کو بے سہارا چھوڑنے کے بجائے ان کے لیے انتظام کر کے جاؤ۔

ان دو مثالوں سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو یہ اصول دیا کہ ضرورت کے لیے معاشیات کی فکر صحیح ہے، لیکن مغربی اصول یہ ہے کہ جتنا زیادہ

سے زیادہ مل سکے چاہے دوسرے کا پیٹ کاٹ کر ملے، اس کی کوشش کی جائے، انسان کا پیٹ ایک حد رکھتا ہے، اور دوسرے انسان بھی انسان ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ انسان کو اگر ایک میدان بھر کے سونا مل جائے تو وہ چاہے گا کہ دوسرا میدان بھی بھر کے مل جائے، اور دوسرا بھی مل جائے تو تیسرے کی خواہش کرے گا، اور فرمایا کہ انسان کا پیٹ مٹی ہی بھرے گی، اور مغربی معاشیات اسی انسان کی مثال ہے، اس کے نتیجہ میں کچھ لوگ بے انتہا دولت مند ہو جاتے ہیں اور کچھ لوگ دو وقت کے کھانے کے بھی محتاج ہو جاتے ہیں، یہ سرمایہ دارانہ نظام میں ہوتا ہے، اور کمیونسٹ معاشی نظام میں تو ایسا طریقہ اختیار کیا گیا کہ معاشی حصول کی کوشش خود اختیاری نہیں رہی اور محنت کرنے والے کو کام کے جذبہ سے محروم کر دیا گیا، اسلام میں دونوں نقص سے بچنے کا انتظام ہے، لہٰذا ان دو مغربی نظاموں سے ہٹ کر جو صورت اسلام کی تعلیمات کے مطابق ہے اس کو بنیاد بنا کر ہم کو اسکیم سوچنی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اسلام میں بطور خاص زکوٰۃ کا بہت اچھا نظام بھی رکھا ہے، اگر اس کا استعمال صحیح ہو تو کوئی پریشانی کی بات نہیں ہو سکتی، اگر زکوٰۃ کا نظام بھی کافی نہ ہوا ہوتا تو اللہ تعالیٰ علیم وخبیر ہے، اس سے زیادہ کا اصول مقرر فرماتا، وہ فرماتا ہے:

﴿وما آتيتم من ربا ليربوا في أموال الناس فلا يربوا عند الله، وما آتيتم من زكوة تريدون وجه الله فأولئك هم المضعفون﴾ [الروم/۳۹] (اور جو تم سود دیتے ہو کہ لوگوں کے مال میں افزائش ہو، تو خدا کے نزدیک اس میں افزائش نہیں ہوتی اور جو تم زکوٰۃ دیتے ہو اور اس سے خدا کی رضامندی طلب کرتے ہو (تو وہ موجب برکت ہے اور) ایسے ہی لوگ (اپنے مال کو) دوچند سہ چند کرنے والے ہیں) پھر سود کی جو شناعت بتائی گئی ہے اور اس کو اللہ تعالیٰ سے

جنگ کرنے کی صورت قرار دی گئی ہے، تو اس کی حیثیت سانپ کی ہے جس کو دیکھ کر آدمی ڈر جائے اور اس سے بھاگے، نہ کہ اس کے قریب ہونے کی کوشش کرے اور اس کے چکنے چکنے جسم پر ہاتھ پھیرے۔

اسلام ایک جامع مذہب ہے، اس میں زندگی کے سارے پہلوں کو سمیٹا گیا ہے، صرف عقیدہ اور عبادت ہی تک محدود نہیں رکھا گیا ہے، بلکہ اس میں ان پہلوؤں کی بھی رعایت رکھی گئی ہے جو انسان کی فطری جائز ضرورتوں سے تعلق رکھتے ہیں، اور ان کا معاشیات سے بھی خاصا تعلق ہے، لہذا اس کی فکر کرنا اسلام میں صرف جائز ہی نہیں، بلکہ بعض موقعوں پر ضروری قرار دی گئی ہے، لیکن اسلام کی اس جامعیت کے ساتھ اس میں مناسب لحاظ رکھنے کو بتایا کہ کون چیز کتنی زیادہ ضروری ہے اور کون چیز کم ضروری ہے، اس کو اس مثال سے بھی سمجھا جاسکتا ہے، کہ ایک بار حضور ﷺ جمعہ کا خطبہ دے رہے تھے، بڑا تجارتی کارواں آیا اور کاروبار سے تعلق رکھنے والے اس کی طرف متوجہ ہوکر اس طرف جانے لگے، اس پر اللہ کی طرف سے گرفت آئی کہ اللہ کی عبادت کی طرف بلایا جارہا ہے ہیں، اس کو چھوڑ کر فوری طور پر مالی منفعت کی طرف توجہ کی جانے لگی، لہذا اس پر تنبیہ ہوئی، لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی فرمادیا گیا کہ تم نماز ادا کرلو اور پھر جاؤ اور اپنی مادی ضرورت کی طلب میں لگو، یہ نہیں کہا گیا کہ ہر حال میں صرف ایک ہی پہلو میں محدود رہو﴿ يأيها الذين آمنوا إذا نودي للصلوة من يوم الجمعة فاسعوا إلى ذكر الله وذروا البيع، ذلكم خير لكم إن كنتم تعلمون، فإذا قضيت الصلوة فانتشروا في الأرض وابتغوا من فضل الله﴾[سورۃ الجمعۃ: ۱۰] (مومنو! جب جمعہ کے دن نماز کے لئے اذان دی جائے تو خدا کی یاد (یعنی نماز) کے لئے جلدی کرو، اور (خریدو) فروخت ترک کردو، اگر تم علم

وسمجھ رکھتے ہو تو یہ بات تمہارے حق میں بہتر ہے، پھر جب نماز ہو چکے تو زمین میں پھیل جاؤ اور خدا کا فضل تلاش کرو) تو اس میں ترتیب بتادی گئی کہ کس کی اہمیت کتنی ہے، لہذا ہم کو دونوں کی فکر کرنا ہے، دوسری مثال حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی ہے کہ وہ بڑے تاجر وکاروباری تھے، جب وہ خلیفہ ہوئے تو اپنے کاروبار کے لئے چلے، حضرت عمر نے ٹوکا کہ امت کے نظم ونسق وانتظام کے کام کیسے ہوں گے؟ انہوں نے کہا کہ اپنے معاش کی ضرورت کا کیا کریں؟ انہوں نے کہا: اس کا معاوضہ حکومت سے لیجئے، تو حکومت کے انتظام کی اہمیت کی وجہ سے راضی ہو گئے، وہ چاہتے تو اپنے معیار کے مطابق معاوضہ لیتے، سربراہ تھے، اسی کے مطابق معاوضہ لے سکتے تھے، لیکن انہوں نے اتنا معاوضہ قبول کیا جس میں کسی قدر فقر کے ساتھ زندگی گزر سکتی تھی اور اس میں اخیر تک سخت رویہ رکھا، جس کا واقعہ تاریخ میں آتا ہے۔

لہذا مسئلہ ترتیب کا ہے، ضرورت ہر پہلو کی ہے، لیکن اس میں اولیت اور ثانویت کا لحاظ رکھنا پڑے گا، اس میں اسلام اور مغربی نقطۂ نظر کا تضاد ہے، لہذا ہم کو اسلامی نقطۂ نظر سے دیکھنا ہے، مغرب نے دولت بڑھانے کو اولیت دی ہے اور اس میں حرص وہوس کو بنیاد بنایا ہے اور اسلام نے اولیت ضرورت کو دی ہے اور انسانی ہمدردی اور سب کی خیر خواہی کو اولیت دی ہے، اسی لئے زکوۃ کا نظام رکھا ہے، مغربی نظام میں سودی بینکوں کو غیر معمولی اہمیت دی گئی ہے، جس کا خراب نتیجہ فوراً تو نہیں نکلتا، لیکن بعد میں اس کا نقصان سامنے آتا ہے، جیسا کہ آجکل اچانک دنیا میں اس وقت واقع ہو رہا ہے، لہذا ہم کو ایسی راہ تلاش کرنی ہے جس کا اچھا پہلو حاصل ہو اور برے پہلو سے ہم بچ سکیں، مدارس دینیہ کو اصل اہمیت دینیہ ہونے کی ہے، اس کیلئے ہم کو اس اصول کو رہنما بنانا ہے جو حضور ﷺ کے

نماز جمعہ کے سلسلہ میں ہمارے سامنے بحیثیت رہنما رکھا گیا ہے۔

اس سلسلہ میں اسلامی اصول کو بنیاد بنا کر غور کرنا چاہیے کہ اسلامی نظام اقتصادیات کو نئے حالات اور نئے تقاضوں کو سامنے رکھتے ہوئے کس طرح مرتب کیا جائے، اقتصادیات زندگی کی اہم ضرورت ہے، اس سے صرف نظر نہیں کیا جاسکتا، لیکن غیروں کے نظام کے اثر سے اپنے کو بچاتے ہوئے اسلامی اصول کے تحت حل ڈھونڈنا چاہیے، اس کے لیے ہمارے مسلم کالجوں اور یونیورسٹیوں میں جہاں ریسرچ کے بھی اچھے انتظامات ہیں، مغربی اصول اقتصادیات کے گرداب میں سے نکلنے کے لیے تحقیق وغور وفکر کا نظام قائم کرنا چاہیے جو کہ اب تک عموماً نہیں ہے، جو کہ افسوس کی بات ہے، دسیوں بیسیوں سال سے وہی مغربی طرز فکر کی ترجمانی جاری ہے، رہے ہمارے دینی مدارس تو وہاں بھی اقتصادیات کا بقدر ضرورت تعارف اور اس میں اسلامی نقطۂ نظر کی تعلیم کا نظام ہونا چاہیے، ہمارے ندوہ میں تو پہلے ہی سے معاشیات بلکہ سیاست کا تعارف باقاعدہ داخل نصاب ہے، چنانچہ میں نے اپنے طالبانہ دور میں ندوہ میں معاشیات اس کتاب کے ذریعہ پڑھی ہے جو حیدرآباد کی عثمانیہ یونیورسٹی کے انٹرمیڈیٹ کے نصاب میں داخل تھی، وہ ہمارے یہاں بھی داخل نصاب تھی، پھر ذاتی مطالعہ سے بی اے کی کتاب بھی پڑھی تھی۔

چنانچہ میں معاشیات کی اہمیت کو سمجھتا ہوں اور اس کے مسائل وتدابیر پر بہتر سے بہتر طریقہ سے غور کرنے کا مخالف نہیں ہوں، اور اس کی فکر کو ضروری سمجھتا ہوں، لیکن اسلامی اصول کو نظر انداز کیے بغیر نہیں، جس میں تجارت وسود کو خلط ملط کیا جاتا ہے، لہذا ماہرین معاشیات اسلام کی محبت میں اور قرآنی حکم کو اہمیت دینے میں کمی نہ کریں۔

مالی اداروں کو سود سے پاک کرنے کی ضرورت

عصر جدید کے سیکولرزم، جمہوریت، قومی آزادی، نیز مغرب کے دیے ہوئے دیگر مختلف النوع افکار اور رجحانات کے سائے میں ان کے اثر سے جو سیاسی اور اقتصادی نظریات اور نظام بنے ہیں وہ سب کے سب بے خدا اور بے آخرت فلسفہ میں ڈوبے ہوئے ہیں، جو مذہبی تصورات اور اسلامی فکر و فلسفہ سے بالکل متعارض ہیں، اسلام جس کو مغربی تہذیب نے ایک فرسودہ تصورات کا مذہب سمجھ لیا ہے، اور وہ اس کو توڑنے پر آمادہ بلکہ کوشاں ہے، ایک جامع اور مکمل طریقۂ حیات ہونے کی وجہ سے مغربی تصورات اور فکر سے ہم آہنگ نہیں ہوسکتا، کیونکہ مغربی فلسفۂ زندگی مذہب بے زاری کے ساتھ ساتھ آزادیٔ فرد پر بالکل آزادانہ یقین رکھنے والا اور دنیاوی منفعت کی طلب کو اپنا اصل مقصد بنانے والا فلسفۂ زندگی ہے، چنانچہ مغرب کے مالی معاملات میں مذہب بیزاری اور دنیاوی منفعت طلبی نے سود و جوا کو پوری زندگی کا جزء بنا دیا ہے، اقتصادیات کو کسی بھی لین دین سے گزرنا پڑے وہ سود کے تانے بانے سے بچ نہیں سکتا، اور مغرب کا دیا ہوا بینک کاری کا نظام دراصل سود کے حصول و فروغ کا موثر ذریعہ بن

گیا ہے۔اور اس کو مغربی تہذیب کی ایک تمدنی ضرورت بلکہ انسانی زندگی کی لازمی ضرورت سمجھ لیا گیا ہے، خواہ اس سے سوسائٹی کے افراد کا کتنا ہی استحصال ہوتا ہو، اور قوم کی اقتصادی بنیاد کو کتنا ہی نقصان پہنچتا ہو، اس شوق نے بنک کاری کو مقصد براری کا ایک مؤثر ذریعہ بنا دیا ہے۔

تاریخ انسانی کا جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ سود کی لعنت دراصل جاہلیت میں مبتلا بیزار اور نفس پرست تہذیبوں اور سوسائٹیوں کا چلن رہی ہے، اس کے برعکس تمام آسمانی مذاہب نے سود کو ممنوع قرار دیا ہے، مسیحیت اور یہودی مذہب میں سود کی حرمت کے احکامات تھے، جن کو ان کے علماء بتاتے اور تاکید کرتے تھے، کیونکہ انجیل اور توریت میں سود کی ممانعت آئی ہے، توریت میں ہے کہ: ''اگر تم میری امت کے کسی فرد کو کچھ مال قرض دو تو اس پر قرض دینے والے کی طرح مسلط نہ ہو جاؤ، اس سے اپنے مال میں منفعت نہ طلب کرو''، اسی طرح بائبل میں بھی آیا ہے کہ ''اگر تم نے ایسے لوگوں کو قرض دیا جن سے تم بدلہ چاہتے ہو تو تمہارا کیا تفوق ہوا، قرضہ دینے میں اس کے فائدے کے متوقع نہ بنو، جب ہی تم کو اچھا ثواب ملیگا''۔

کچھ عرصہ تک مسیحی یورپ کا یہی مسلک ان کے قوانین کا جزء رہا، لیکن مرور زمانہ کے ساتھ ساتھ اس کی شناعت کم ہوتی گئی، یہاں تک فرانسیسی انقلاب نے تو سود کی ممانعت کا خاتمہ کر دیا، اور اس کی جنرل کونسل نے ایک قانون بنا کر سود کا لین دین سب کے لئے جائز کر دیا، پھر یورپ نے اپنی مذہب بیزاری اور مال کی ہوس میں اس لعنت کو اپنی اقتصادی زندگی کے رگ و پے میں سمو لیا، اور جہاں جہاں اس نے اپنی تہذیب پہنچائی وہاں وہاں اس لعنت کو عام کر دیا، اور زندگی کے ہر شعبہ میں اس کو پرو دیا، اور اب سود یورپ کے اقتصادی ڈھانچہ کے رگ و پے میں داخل

ہوگیا ہے اور سود کو رواج دینے میں یہودیوں کا بڑا کلیدی حصہ ہے۔

غیر جانب دارانہ جائزہ لینے سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ سودی لین دین نہ صرف دینی بلکہ دنیاوی اعتبار سے بھی کوئی صحت مندانہ عمل نہیں ہے، وقتی اور فوری طور پر سودی قرض لینے والے کو اپنی پریشانیوں کا حل محسوس ہوتا ہے، اور دینے والے کو اپنی آمدنی کا ایک آسان ذریعہ معلوم ہوتا ہے، لیکن سودی کاروبار کا معاشرہ اپنے اقتصادی حالات کے لحاظ سے اندر اندر کھوکھلا ہوتا جارہا ہے، چنانچہ اس وقت دنیا کے بے شمار ملک اقتصادی اعتبار سے کھوکھلے اس وجہ سے ہوتے جارہے ہیں کہ انہوں نے سودی قرض کے انبار لگا لئے ہیں، چنانچہ وقتی ترقیات کے باوجود اقتصادی خوشحالی ان کے لئے سراب سے زیادہ نہیں رہ گئی ہے، امریکہ جیسے عظیم دولت مند ملک کے ماہرین اقتصادیات وہاں کی روز افزوں اقتصادی گراوٹ سے پریشانی ظاہر کررہے ہیں، یہ سپر پاور ملک سودی بوجھ کے تلے دبا ہوا ہے اور سود لینے والے ملک سودی بار سے بدحواس ہیں، خود ہندوستان اپنے بجٹ کا ایک بڑا حصہ سود ادا کرنے میں صرف کرتا ہے جس کی تعداد میں سال بسال اضافہ ہی ہوتا جارہا ہے اور ملک کی آمدنی کا ایک حصہ صرف سود کی ادائیگی میں صرف ہوتا ہے۔

اسلام میں سود سختی کے ساتھ حرام قرار دیا گیا ہے، سود کی مذمت اور اس کی ناپسندیدگی کا تذکرہ قرآن کریم میں چار جگہ ہے، شروع میں سورہ روم کی یہ آیت نازل ہوئی ﴿و ما آتيتم من ربا ليربو في أموال الناس فلا يربو عند الله و ما آتيتم من زكاة تريدون وجه الله فأولئك هم المضعفون﴾ [سورہ روم: ۳۹] (تم جو سود پر دیتے ہو کہ لوگ کے مال میں بڑھتا رہے، وہ اللہ کے یہاں نہیں بڑھتا، اور جو کچھ صدقہ وزکوۃ تم اللہ تعالی کی خوشنودی کے لئے دو، تو

ایسے لوگ ہی ہیں اپنا دو چند کرنے والے) اس آیت کے ذریعہ مادی نفع اندوزی کے شوق کی اللہ تعالی کے یہاں ناپسندیدگی اور اس سے ترقی نہ ہونے کی بات کہی گئی ہے، اور اس کے برعکس اللہ تعالی کی مرضی کے حصول کے لئے زکوۃ ادا کرنے کا فائدہ بتایا گیا ہے، اور اس طرح ایک طرف مادی نفع اندوزی کی قباحت ظاہر کی گئی ہے، اور خیر خیرات کے ذریعہ اللہ تعالی کی رضا کے حصول کی طرف رغبت دلائی گئی ہے، دوسری جگہ سورہ نساء میں یہ آیت نازل ہوئی ﴿فبظلم من الذين هادوا حرمنا عليهم طيبات أحلت لهم، وبصدهم عن سبيل الله كثيراً، وأخذهم الربا و قد نهوا عنه وأكلهم أموال الناس بالباطل، و اعتدنا للكافرين عذاباً أليماً﴾ [سورہ نساء: ۱۶۰-۱۶۱] (چنانچہ یہودیت اختیار کرنے والوں کی زیادتی کی بنا پر جو نفیس چیزیں ان کے لئے حلال کی گئیں تھیں وہ ہم نے ان پر حرام کردیں، ان کے ظلم کے باعث اور اللہ تعالی کی راہ سے اکثر لوگوں کو روکنے کے باعث، اور سود جس سے ان کو سختی سے منع کیا گیا تھا، اسے لینے کے باعث اور لوگوں کا مال ناحق مار کھانے کے باعث اور ان میں جو کفار ہیں ہم نے ان کے لئے المناک عذاب مہیا کر رکھا ہے)، اس آیت سے سود کی شناعت اور برائی سختی کے ساتھ دماغوں میں بٹھائی گئی، پھر سورہ آل عمران کی آیت نازل ہوئی ﴿يأيها الذين آمنوا لا تأكلوا الربا أضعافاً مضاعفة و اتقوا الله لعلكم تفلحون﴾ [۱۳۰] (اے ایمان والو! بڑھا چڑھا کر سود نہ کھاؤ، اور اللہ تعالی سے ڈرو تاکہ تمہیں نجات ملے) اس میں سود لینے سے منع کیا گیا ہے، پھر اس کی مزید شناعت اس آیت سے ظاہر کی گئی ہے جو سورہ بقرہ کا جزء ہے ﴿الذين يأكلون الربا لا يقومون إلا كما يقوم الذي يتخبطه الشيطان من المس ذلك بأنهم قالوا إنما البيع مثل الربا و أحل الله

البیع و حرم الربا﴾[۲۷۵] (جولوگ سود کھاتے رہتے ہیں وہ لوگ نہ کھڑے ہوسکیں گے، سوا اس کے کہ جیسے وہ کھڑا ہوتا ہے جسے شیطان نے جنون سے خبطی بنا دیا ہو، یہ سزا اس لئے ہوگی کہ وہ کہتے ہیں کہ بیع بھی تو سود ہی کی طرح ہے حالانکہ اللہ نے بیع کو حلال کیا ہے اور سود کو حرام کیا ہے)، اور فرمایا: ﴿یا أیها الذین آمنوا اتقوا الله، و ذروا ما بقی من الربا إن کنتم مؤمنین، فإن لم تفعلوا فاذنوا بحرب من الله و رسوله، و إن تبتم فلکم رء وس أموالکم لا تظلمون و لا تظلمون، و إن کان ذو عسرة فنظرة إلی میسرة، و أن تصدقوا خیر لکم إن کنتم تعلمون، و اتقوا یوماً ترجعون فیه إلی الله ثم توفی کل نفس ما کسبت و هم لا یظلمون﴾ [سورہ بقرۃ:۲۷۸-۲۸۱] (اے ایمان والو! اللہ تعالی سے ڈرو، اور جو سود باقی رہ گیا ہے وہ چھوڑ دو، اگر تم سچ مچ ایمان والے ہو، اور اگر ایسا نہیں کرتے تو اللہ تعالی سے اور اس کے رسول سے لڑنے کے لئے تیار ہو جاؤ، ہاں اگر توبہ کرلو تو تمہارا اصل مال تمہارا ہی ہے، نہ تم ظلم کرو نہ تم پر ظلم کیا جائے، اور اگر کوئی تنگی والا ہو تو اسے آسانی تک مہلت دینی چاہیئے اور صدقہ کرو تو تمہارا لئے بہت ہی بہتر ہے اگر تم میں علم ہو، اور ڈرو اس دن سے جب تم اللہ تعالی کے پاس لوٹائے جاؤ گے، پھر ہر فرد کو وہ پورا پورا دیا جائے گا جو اس نے دنیا کی زندگی میں کمایا ہے اور ان کے ساتھ زیادتی نہ کی جائے گی)۔

ہر سود خوار تمدن کا تصور یہ ہے کہ تجارت سے حاصل ہونے والا نفع اور سود سے حاصل ہونے والا فائدہ ایک ہی طرح کی بات ہے، یہی وہ تصور ہے جس کے بموجب موجودہ تمدن نے تجارت اور سودی لین دین کو ایک دوسرے سے وابستہ بلکہ مخلوط کر رکھا ہے، اس نظام کے فلسفہ کے بموجب انہوں نے تجارت اور

سودی لین دین میں کوئی فرق نہیں رکھا ''و قالوا إنما البیع مثل الربا'' لیکن اسلام نے اس کے جواب میں اس کی دلیل کو توڑتے ہوئے ان کے اس فلسفہ کے بالکل مختلف دوسرا صاف اور منصفانہ نقطۂ نظر بتایا ہے، جس میں بنیاد خود اللہ تعالی کا کسی بات کو اچھا قرار دینا اور کسی بات کو خراب قرار دینا ہے، اسی نے انسانوں کو پیدا کیا ہے اور وہی انسانوں کے فائدہ ونقصان کو سب سے زیادہ جانتا ہے، وہ کسی بات کو منع کرتا ہے تو وہ بات واقعۃ انسان کے لئے مضر ہوتی ہے پھر وہ سب انسانوں کا خالق ہے اس لئے بھی اس کے حکم کو ماننا ضروری ہے، چنانچہ اس نے سود کی مذمت کے ساتھ فرمایا ''أحل الله البیع و حرم الربا''۔(تجارت کو اللہ رب العالمین نے جائز قرار دیا ہے اور سود کو ناجائز)۔

سود یہودی مذہب میں حرام کیا گیا، پھر عیسائی مذہب میں بھی حرام قرار دیا گیا، اس طرح یورپ اور امریکہ میں جہاں عیسائی اور یہودی بسے ہوئے ہیں، ان کے لئے سود کو پورے زور شور کے ساتھ چلانے کا جو چلن ہے وہ ان کے مذہب کے لحاظ سے بھی گناہ ہے، لیکن ان کو اس کی پرواہ نہیں، بلکہ اس کو مالی معاملات میں ضروری بنا رکھا ہے، حالانکہ صرف دینی لحاظ سے ہی نہیں، دنیاوی لحاظ سے بھی برے نتائج کا حامل ہے، لہذا یورپ کا سارا انظام حرام وحلال کی پرواہ نہ کرنے کے فلسفہ پر قائم ہے، یہ نظام اختیار کر کے خواہ اس میں چند ترمیمات کر دی جائیں، اس کے سب مفاسد سے نہیں بچ سکتے، ایسی صورت میں ہم مسلمانوں کو اپنے لئے علیحدہ نظام وضع کرنا ہوگا، جس میں خدا اور رسول کی ہدایات سے حاصل کردہ فلسفہ کارفرما ہو، اسی میں ہماری تمام مشکلات کا صحیح حل ہے، دراصل یہ فلسفہ اس آیت سے ماخوذ ہوگا ﴿و ما آتیتم من ربا لیربوا في أموال الناس فلا یربوا عند الله و ما آتیتم من زکاة تریدون وجه الله

فأولئك هم المضعفون﴾[سورہ روم:۳۹]۔

اس کی روشنی میں ہمارے مالی اداروں کے قیام وانصرام میں جذبہ مخلصانہ و ہمدردی کا ہوگا، کہ اللہ تعالی کی رضا کو غرض بنا کر ہم کو خیر کے جذبہ سے لوگوں کی مدد کرنا ہے نہ کہ یہ جذبہ ونیت کہ تعاون و ہمدردی میں ہمارا کیا مادی نفع ہے اور ہم کو کیا ملے گا؟، اس طرح صرف خود غرضانہ رویہ سامنے آئے گا، اور اس سے آپسی ہمدردی اور آخرت میں اجر وثواب کی طلب کا جذبہ بالکل مفقود ہو جائے گا۔

باب سوم

دعوتِ حق

- دعوت واصلاح کے عمل کی ضرورت
- اسلامی کاز کے دو وسیع میدان، تبلیغ اسلام اور اصلاح معاشرہ
- اسلامی بیداری کے لئے علمی اور نشریاتی جدوجہد کی ضرورت
- اسلام اور مسلمانوں کا دفاع - علماء وقائدین کی اہم ذمہ داری
- دعوتی کام امت مسلمہ کے تحفظ وبقا کا ضامن
- ہمارا کردار غیر مسلموں میں

دعوت واصلاح کے عمل کی ضرورت

اس زمانے میں بلکہ ہر زمانہ میں اسلامی عمل کا سب سے بہتر وہ طریقۂ کار ہے جس کی بنیاد دعوتی جذبہ وطریقۂ کار پر قائم ہو نہ کہ انقلابی شور وشر رو جارحیت پر، اگرچہ انقلاب کا نعرہ مظلوم ومحروم طبقوں کا سب سے پسندیدہ نعرہ ہے۔ اس لئے کہ مظلوم اور دبے کچلے ہوئے لوگوں کا دل ظالم وجابر کے خلاف جب بھڑک اٹھتا ہے تو وہ اس بات سے کم پر راضی نہیں ہوتے کہ ظالم وجابر کے قلعوں کو پوری طرح مسمار کر دیا جائے اور جتنی سخت سزا ان کو دی جاسکتی ہو وہ دی جائے حالانکہ سنجیدہ انسانی ذہن بہت سی حالتوں میں اس کی تائید نہیں کرتا، اور رسولِ اکرم ﷺ کا طریقۂ کار بھی اس سے مختلف تھا، رسول اللہ ﷺ اور آپ پر ایمان لانے والوں نے کفارِ قریش کی سخت ترین ایذاؤں کو برداشت کیا یہاں تک کہ آپ ﷺ کو اپنے محبوب وطن کو خیر باد کہنا پڑا، بیت اللہ شریف کی زیارت سے بھی ایک مدت کے لئے محروم ہونا پڑا، وہ آپ ﷺ اور تمام مسلمانوں کے نزدیک سب سے مقدس گھر تھا، پھر آپ ﷺ جب مکہ میں فاتح کی حیثیت سے

داخل ہوئے تو قریش کے ظالموں کو معاف کر دیا اور ان سے انتقام نہ لیا، اسی طرح سے آپ ﷺ کو طائف میں سخت تکلیف پہنچائی گئی اور نہایت بے عزتی کے ساتھ آپ کو وہاں سے نکالا گیا اور آپ ﷺ کو اس کی پیشکش کی گئی کہ اللہ آپ کے مخالفین سے اس طرح انتقام لے کہ ان کو دو پہاڑوں کے درمیان پیس کر ہلاک کر دیا جائے تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ میں ایسا نہیں چاہتا ہوں، میں امید رکھتا ہوں کہ ان کی نسل سے صالح مسلمان پیدا ہوں گے۔

یہ طریقہ کار آپ ﷺ نے اس لئے اختیار کیا کہ اسلام کے فروغ کے لئے دعوتی انداز و طریقہ کار ہی مفید تھا نہ کہ انتقام و تشدد، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کے مطالعے سے ہم کو غیروں پر اثر ڈالنے اور قریب کرنے کا طریقہ اخذ کرنا چاہئے، ہمیں اپنے تمام اعمال میں غور کرنا چاہئے کہ ہم کس طریقے سے لوگوں کو دوست بنا سکتے ہیں اور کیسے دوسروں کے ذہن و دماغ کو مطمئن کر سکتے ہیں اور کیسے لوگوں کو اپنے سے قریب کر سکتے ہیں اور ان کے دلوں کو اسلام کے سمجھنے کے لئے کیسے کھول سکتے ہیں، اسلام کی فکری تاریخ بتاتی ہے کہ اسلامی فکر کو اسی قدر فروغ ہوا جس قدر اس فکر کے داعیوں کی سنجیدہ و مخلصانہ کوششیں رہیں، ہم دیکھتے ہیں کہ اسلام عرب تاجروں کی سنجیدہ مخلصانہ کوششوں سے پھیلا وہ اپنے اردگرد کے لوگوں کو اپنی ہمدردی و غمخواری و خیر خواہی اور اپنے اخلاق اور نیکیوں کا حکم اور برائیوں سے روکنے کے ذریعے سے مانوس کرتے تھے ان کی تاثیر سے دنیا کے گوشے گوشے میں یہ دین پھیلا اور ان کی دعوت برابر قوت و تیزی سے ملکوں میں پھیل رہی ہے۔

جو لوگ اسلامی عمل کے لئے دعوت کے سنجیدہ راستے کو چھوڑ کر تشدد اور سختی کا راستہ اختیار کرتے ہیں کامیابی ان کو بھی ملتی ہے۔ لیکن عموماً ان کی کامیابی کا

دائرہ بہت محدود ہوتا ہے، بلکہ بعض وقت ان کا طریقہ کار لوگوں کو اسلام سے برگشتہ کرنے کا سبب بن جاتا ہے۔

متعدد مسلمان ملکوں میں تشدد وسختی کے طریقہ کار نے کمیونزم اور سوشلزم کی تحریکوں کے اثر سے اسلام پسندوں کے ذہن کو متاثر کیا، چنانچہ اسلام کے متعدد داعیوں نے تشدد و سیاست کے طریقہ کار کو اپنانے کی کوشش کی، انہوں نے عام لوگوں کے دلوں میں انقلابی نعروں کی کشش کو بھی محسوس کیا لہٰذا اسی میں انہیں اپنی دعوت کی کامیابی کا راستہ نظر آیا، لیکن اس راستے سے وہ اکثر حالات میں اپنے مطلوبہ مقصد تک نہ پہنچ سکے اور پیچیدہ مسائل کو سلجھانے میں اور مصیبتوں و تکلیفوں کے مقابلے میں کم لوگوں نے ان کا ساتھ دیا، بلکہ مزید یہ کہ ان کے اثر سے اسلام کا پیغام سمجھنے میں بہت سے لوگوں نے غلطی کی اور عملی طور پر اس کو بروئے کار لانے میں کمتر تائید کی، انہوں نے اسلام سے خوف محسوس کیا اور اس کے نفاذ میں مدد دینے میں عملی حصہ نہیں لیا، اس کا سبب یہ ہے کہ وہ لوگ اسلامی نعروں کے اردگرد ان کی اثر پذیری اور ان کی خوبصورتی سے متاثر ہو کر جمع ہو گئے تھے اور عملی طریقہ کار جو ان نعروں کے پیچھے تھا وہ ان کے سامنے نہیں آیا تھا چنانچہ ان کو ذہن میں لا کر انہوں نے ان سے خوف محسوس کیا اور اس کے نتیجے میں کوششیں رائیگاں چلی گئیں۔

ہم پر ضروری ہے کہ ہم عملی صورت کا جائزہ لیں اور اسلام کے فروغ کے لئے اپنے طریقہ کار کا تجزیہ کریں، کیا ہم نے اسلامی افکار و اصول کو ذہن نشین کرانے کے لئے مناسب طریقہ کار اپنایا، یا وہ طریقہ جس سے لوگوں کو خوف محسوس ہوتا ہو، ہم لوگوں سے جاہ وسلطنت چھیننا چاہتے ہیں، ہمارا یہ اعلان کہ نظام کو بدل دیا جائے، اور حکومتوں کو پلٹ دیا جائے، اور ان باطل طاقتوں سے مقابلہ

کیا جائے، کیا اس سے خاطر خواہ مطلوبہ نتائج نکلتے ہیں یا ہمارے اس طریقۂ کار سے اسلام مخالف طاقتیں جو کہ اسلام کو اپنے مفاد و منافع کی راہ میں خطرہ سمجھتی ہیں حرکت میں آجائیں گی۔ اور وہ اسلام پسندوں اور اسلام کی قوت کے اسباب کا خاتمہ کرنے کے لئے اپنے پورے وسائل کا استعمال کریں گی۔

اسلامی فکر کے ہم نواؤں کو فکرِ اسلامی کے تعارف کرانے، لوگوں کو زیادہ سے زیادہ اس کی طرف مائل کرنے، اسلام کو لوگوں کی ذاتی زندگیوں میں نافذ کرنے، اور اسلام کی محبت کو لوگوں کے دلوں میں جاگزیں کرنے کے لئے ہمیں بہت زیادہ اہتمام کرنا ضروری ہے تاکہ ہر وہ چیز جس کا اللہ اپنے بندوں کی زندگیوں میں نفاذ چاہتا ہے اس کے قبول کرنے کا داعیہ پیدا ہو سکے، اور وہ اس طور پر کہ عام لوگوں کے دلوں میں ہمارا یہ عمل خوف نہ پیدا کرنے والا ہو اور ان کو اس کا احساس نہ ہو کہ اگر اسلام کو عام لوگوں کی زندگیوں میں نافذ کیا گیا تو وہ ان کو خیر اور خوش نصیبی سے محروم کرے گا اور وہ ان کے لئے مصیبتوں و پریشانیوں کا سبب بن جائے گا، اسلام ایک ایسا مذہب ہے کہ اگر لوگ اس کو اچھی طرح سمجھ لیں تو لوگ اس کو زندگیوں میں نافذ کرنے سے ہرگز خوف محسوس نہ کریں گے، اس کے حصول کے لئے اسلام کے داعیوں کو سخت کوشش کی ضرورت ہے، یہاں تک کہ اسلام کو اچھی طرح سمجھنے والوں اور اس کے ماننے والوں کی تعداد اتنی ہو جائے، جو اس سے خوف محسوس کرنے والوں سے کم نہ ہو۔

اسلامی کاز کے دو وسیع میدان

تبلیغ اسلام اور اصلاح معاشرہ

اسلامی کاز کے دو وسیع میدان ہیں اول ان تمام چیزوں کی تبلیغ جن سے لوگوں کا واقف ہونا ضروری ہے، دوسرا بدعنوانی اور انحراف کی صورت حال کو ممکنہ وسائل کے ذریعہ عدل و انصاف خیر خواہی و استقامت میں تبدیل کرنے کی مخلصانہ جد جہد، بسا اوقات یہ دونوں میدان ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو کر باہم مل جاتے ہیں اور کبھی جدا جدا، لیکن بقدر ضرورت ہر میدان کا حق ادا کرنا ضروری ہے، اور اس کیفیت کے ساتھ جس کو اسلام نے مشروع و مستحسن اور بندوں کے حقوق کی رعایت کرتے ہوئے لوگوں کے لئے جائز گردانا ہے، حالانکہ ہر میدان کو اس کا حق دینے اور ہر ایک کو اس کے صحیح مقام پر استعمال کرنے میں اکثر کوتاہی ہوتی ہے جس کی وجہ سے اسلام کے متعلق لوگوں کے ذہنوں میں غلط تصویر آتی ہے اور اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بتائے ہوئے صحیح طریقہ کے مطابق حقوق کی ادائیگی میں نقص اور خلل پیدا ہو جاتا ہے۔

یہ ہر مسلمان کہتا ہے کہ مسلمانوں کی زندگی شریعت اسلامی کے مطابق ہوجائے، مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد کے ذہن میں یہ عظیم مقصد موجزن ہے، لیکن اس مقصد کو بروئے کار لانے کیلئے جو کوششیں جاری ہیں بسا اوقات وہ اس عمل کے تقاضوں کو پورا نہیں کرتیں، بلکہ صراط مستقیم سے ہٹی ہوئی نظر آتی ہیں اس لئے کہ اس عمل کا اصل مقصد لوگوں کے پاس حق کا پیغام پہنچا کر ان کو مطمئن کرنے کی بھرپور کوشش کرنا اور ان کے نظریات کو درست کرنا اور اسلام کے حق میں خوشگوار فضا ہموار کرنا ہے۔

افسوس ہے کہ ہمیں اس میدان میں ایک بہت بڑا خلا نظر آتا ہے اور جب اس میدان میں بے اعتنائی سے کام لیا جاتا ہے تو پھر بیشتر حالات میں ساری کوششیں کھوکھلا نعرہ ہو کر رہ جاتی ہیں۔

یہ حقیقت ہے کہ شور و شغب اور نعرہ بازیوں کا بھی دل و دماغ پر ایک تأثر ہوتا ہے، لیکن محض نعروں کے ذریعہ سے مخالفت کو روکا نہیں جاسکتا، بلکہ اسلام کی حقیقت کو واضح اور زندگی کے مسائل کو حل کرنے میں اس کی صلاحیت و لیاقت پر اطمینان کامل ہی کے ذریعہ اس سیل رواں کا مقابلہ کیا جاسکتا ہے، لیکن اطمینان پیدا کرنے کی یہ صلاحیت ذہنوں اور عقلوں تک لے جانے والے راستے اور تعلیم و تربیت کے حکیمانہ و دانش مندانہ طریقے اپنا کر ہی حاصل ہوسکتی ہے، یہ انتہائی افسوسناک بات ہے کہ مسلمان عام طور پر اس میدان میں پیچھے رہ گئے، بلکہ مسلمان ان دونوں میدانوں میں کسی اہم اقدام سے غافل ہیں جب تک زندگی کے مسائل کو حل کرنے کے لئے ہماری اسلامی غیرت و حمیت اور اسلامی حقانیت پر ہمارے اعتقاد کے باوجود صرف زبردست مظاہروں و جذباتی سرگرمیوں اور غیر منصوبہ بند کوششوں پر انحصار ہے اس وقت تک ہماری کامیابی محدود اور غیر معیاری انداز میں اپنوں سے آگے نہیں بڑھ سکتی اور ایسی صورت میں اسلام کی افادیت سمٹ کر

رہ جائے گی اور بیشتر حالات میں خاطر خواہ فائدہ حاصل نہیں ہو سکے گا۔ اس لئے کہ اپنوں کی ہمنوائی تو حاصل ہی ہے ان کی طرف سے ہمارے خلاف کوئی یلغار نہیں، حملے تو غیروں کی طرف سے ہیں، لہٰذا ہمیں غور اس بات پر کرنا ہوگا کہ ہم نے ان کے مقابلے کے لئے کس قدر تیاری کی ہے، کیا ہم نے ان غلط فہمیوں کو دور کرنے کا کوئی مناسب اقدام کیا ہے جو اسلام کے متعلق ان کے ذہنوں میں جڑ پکڑ چکی ہیں؟ کیا ہم نے اپنے سے قریب کرنے میں ان کی نفسیاتی الجھنوں کو دور کیا ہے؟ کیا ہم نے ان کے سامنے اسلامی تعلیمات اور مسلمانوں کے اخلاق کریمانہ کا کوئی اعلیٰ نمونہ پیش کیا ہے؟

جب ہم اس میدان میں اپنی کوششوں کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمارا عمل تقریباً صفر نظر آتا ہے اس حقیقت سے واقفیت کے لئے ہمیں بہت دور جانے کی ضرورت نہیں بلکہ جب ہم کسی بھی ملک میں جا کر وہاں کسی پبلک لائبریری یا بک اسٹال کا جائزہ لیتے ہیں تو وہاں ہمیں اسلام کے متعلق کوئی قیمتی ذخیرہ دیکھنے کو نہیں ملتا۔ البتہ پورا کتب خانہ ایسے لٹریچر سے بھرا ہوا نظر آتا ہے جو اسلام کو بگاڑنے اور قاری کو اسلام سے متنفر کرنے میں ایک کلیدی رول ادا کرتا ہے۔

دشمنان اسلام کا تو شکوہ ہی کیا وہ تو اپنی خامہ فرسائی میں آزاد ہیں۔ البتہ ذرا خود مسلمانوں کے حالات کا جائزہ لیجئے کیا ان کی طرف سے ایسی کتابیں وجود میں آتی ہیں جس سے اسلام کے بارے میں یہ تصور پیدا ہو کہ وہ ایک صاف ستھرا تعمیری مذہب ہے جو انسانیت کو تباہی سے بچانے میں اپنا ایک نمایاں کردار رکھتا ہے یہ خلا کیوں ہے؟ کیا اس کا سبب یہ ہے کہ صلحاء امت دوسری زبانوں سے کوئی واقفیت نہیں رکھتے؟ یا معمولی اور سطحی زبان جانتے ہیں؟ ایسا ہرگز نہیں اس لئے کہ مسلمانوں میں ایسے افراد موجود ہیں جو دوسری زبانوں میں ماہر ہیں،

بلکہ بعض ادباء اہل زبان کی طرح دوسری زبانوں میں لکھنے پر پوری قدرت رکھتے ہیں، آخر ان حضرات کی کوشش کسی میدان میں صرف ہو رہی ہیں، وہ ایسی مؤثر زبان و اسلوب میں اپنی نگارشات و تحقیقات کیوں نہیں پیش کرتے جس سے اسلام سے متعلق غیروں کی غلط فہمیاں دور ہوں اور اسلام کے بارے میں ان کے سوچنے کا طرز بدل جائے اسلام اور مسلمانوں کے متعلق لکھی گئی اکثر کتابیں ان مستشرقین کی کاوشوں کا نتیجہ ہیں جن کے ذہنوں میں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف شدید ردعمل پایا جاتا ہے یا مغربی اہل دانش کے دام تزویر میں پھنسے ہوئے مسلم مصنفین کے افکار کا ثمرہ ہیں جو اسلام اور مسلمانوں کی حقیقت سے بالکل نا آشنا ہیں۔ ان لوگوں کا الزام ہے کہ اسلام زور و زبردستی اور جبر و اکراہ سے پھیلا ہے جس کا اصل مقصد اقتصادی اور قومی مہم جوئی تھا۔ اگر وہ مسلمانوں کے اخلاق کی ترجمانی بھی کرتے ہیں تو ان کو قبائلی خودستائی اور جنسی خواہشات کی تسکین کی فکر و جستجو میں سرگرداں ہونے کا نشانہ بناتے ہیں۔ پوری دنیا میں ہمارے دشمنوں اور حریفوں کی نظر میں مسلمانوں کے اخلاق کے یہی معنی ہیں، دشمنانِ اسلام کے ادباء و مفکرین نے انہیں پہلوؤں کو موضوع سخن بنایا ہے اور ان اختراعی پہلوؤں کو انہوں نے اپنی ادبی تصنیفات اور اجتماعی و انسانی علوم کی کتابوں میں درج کیا ہے، یہی کتابیں یونیورسیٹیوں کالجوں اور مدارس میں داخل نصاب ہیں۔ یہی کتابیں محققین کا مرجع ہیں، ایک محقق ریسرچ اسکالر اور اکثر مقامات پر فرزندان اسلام کا اعتماد بھی انہیں تصنیفات پر ہے اور ہم عرصۂ دراز تک ان تمام چیزوں سے غافل و ناواقف خواب خرگوش میں مبتلا رہے، یہاں تک کہ پانی سر سے اونچا ہو گیا اور موقع ہاتھ سے جاتا رہا اور جب خواب غفلت سے بیدار ہوئے تو اپنے حریفوں اور دشمنوں کے خلاف طعنہ زنی اور سب و شتم میں مبتلا

ہو گئے۔ ہمارے اس طرز سے دشمن کے عناد و غضب کی آگ اور بھڑک اٹھی، اس کی نفرت بڑھ گئی اور سرگرمیوں کو دیکھ کر دشمنوں نے حمیت اسلامی کی طاقت کو توڑ دینے کا پختہ ارادہ کر لیا۔

عہد اول میں مسلمانان عرب شمع ہدایت تھے، کسی بھی غرض سے وہ کہیں جاتے وہاں کے لوگوں کے اخلاق پر ان کے اخلاق کا گہرا اثر پڑتا، ان کو دیکھ کر لوگوں کے ذہن بدل جاتے، ملک کو فتح کرنے سے پہلے وہاں کے باشندوں کے دلوں کو جیت لینا ان کا امتیاز تھا، جس کو بھی ان سے ملاقات یا ان کے ساتھ رہنے کا موقع مل جاتا وہ ان کا گرویدہ ہو جاتا تھا۔ جب وہ مشرق بعید پہنچے تو وہاں کے لوگ ان کے کردار کے سامنے سرنگوں ہو گئے اور ملک فتح کرنے کے لئے ان کو کسی قسم کے اسلحہ کی ضرورت پیش نہیں آئی، ملیشیا، انڈونیشیا، چین کے علاقے اور ہندوستان کے ساحلی علاقوں کی تاریخ میں کہیں اس بات کا تذکرہ نہیں ملتا کہ مسلمانوں نے ان کے ساتھ جہاد و قتال کر کے تلوار کے حملہ سے ان کو اسلام میں داخل کیا ہو، بلکہ ان کے کردار کی پختگی اور شیریں گفتاری نے یہاں کے لوگوں کے دل موہ لئے اور وہ برضا و رغبت اسلام کی گود میں داخل ہو گئے۔

آج مسلمانوں کی زندگی کی جو تصویر غیروں کے سامنے آرہی ہے اس سے تو مسلمانوں سے نفرت اور اسلام بیزاری میں اضافہ ہو رہا ہے، ان کی ذہنی الجھنیں اسلام کے تعلق سے بڑھ رہی ہیں مزید برآں غیر مسلم ممالک میں اسلام کا صحیح نظریہ رکھنے والے اور علم و ادب کے ایسے ماہرین ناپید ہیں جو اپنی مومنانہ خصوصیات و صفات سے ان کے ذہنوں کا رُخ بدل سکیں، رجحانات و نظریات کی اصلاح کے لئے تعلیم و تبلیغ کے جدید طریقے اختیار کریں، تحقیقی مضامین تیار کریں، اور ایسے ادب کو جنم دیں جس سے اسلام اور مسلمانوں کے متعلق ایک صحیح

اور سنجیدہ تصور قائم ہو سکے، اس کام کے لئے ہمیں انہیں کی زبان استعمال کرنی ہوگی جو ہمارے مخاطب ہیں۔

اسلام کے حامیوں اور حریفوں، اسلامی بیداری کو فروغ دینے والوں اور صہیونی اور نصرانی طاقتوں کے حاشیہ برداروں کے درمیان مشرق و مغرب میں جو خونریز معرکہ آرائی قائم ہے اس کا مقابلہ پوری ثبات قدمی کے ساتھ لازم ہے، اس سلسلہ میں ہرگز کوئی کوتاہی نہیں ہونی چاہئے۔ غلبہ کے حصول کے لئے جان توڑ کوشش ضرور کرنا چاہئے، لیکن یہ پورا ایک محاذ ہے اس کے ساتھ ان محاذوں پر بھی کام کرنا ضروری ہے جن کو ہم نے پسِ پشت ڈال دیا ہے اور آج تک ان سے غافل ہیں۔ دعوت و تبلیغ، اعلیٰ اخلاق اور حکمت و موعظت کے میدانوں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لینا چاہئے۔ تاکہ اللہ رب العزت کے فرمان کی اتباع پورے طور پر ہو سکے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ﴾ (نحل:۱۲۵)

"آپ اپنے رب کی راہ کی طرف علم کی باتوں اور اچھی نصیحتوں کے ذریعہ سے بلائیے اور ان کے ساتھ اچھے طریقے سے بحث کیجئے"

دوسری جگہ ارشاد فرماتے ہیں کہ:

﴿وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِیْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰی یَسْمَعَ كَلَامَ اللّٰهِ ثُمَّ اَبْلِغْهُ مَاْمَنَهٗ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا یَعْلَمُوْنَ﴾ (سورہ توبہ:۶)

"اور اگر کوئی شخص مشرکین میں سے آپ سے پناہ کا طالب ہو تو

آپ اس کو پناہ دیجئے تا کہ وہ کلام الٰہی سن لے پھر اس کو اس کی امن کی جگہ پہنچا دیجئے (حکم) اس سبب سے رہے کہ وہ ایسے لوگ ہیں جو پوری خبر نہیں رکھتے"۔

آگے بڑھنا ہے تو پھر سوچ لو راہیں اپنی
زندگی آج نئے موڑ پر آپہنچی ہے

اسلامی بیداری کے لئے
علمی اور نشریاتی جدوجہد کی ضرورت

مغربی تہذیب وتمدن سے مرعوب ومتاثر اکثر وبیشتر لوگ اسلام سے خوف محسوس کرتے ہیں، اس لیے کہ اسلام کے متعلق ان کی معلومات کا دائرہ مرد وعورت کے چند مسائل تک محدود ہے اور انہیں ان سہولتوں اور حقوق کا علم نہیں جو اسلام اپنے ماننے والوں کو مختلف شعبہ ہائے حیات میں انہیں عطاء کرتا ہے حضور کریم ﷺ کا معمول تھا کہ جب آپ کو دو چیزوں میں سے کسی ایک چیز کے اختیار کرنے کی اجازت ملتی تو آپ آسان وسہل کو اختیار فرماتے اور مشکل کو ترک فرمادیتے، رسول اکرم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

"إنّ لِنَفسِكَ عَلَيكَ حَقًّا وإنّ لِزوجك عليك حقًّا وإنّ لعينك عليك حقًّا"۔

"تمہاری جان کا بھی تم پر حق ہے تمہاری بیوی کا بھی تم پر حق ہے اور تمہاری آنکھوں کا بھی تم پر حق ہے"

اسلام اپنے پیروکاروں کو ماکولات ومشروبات میں سے پاکیزہ اور طاہر کے استعمال کی مکمل آزادی دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے رزق حلال سے فائدہ اٹھانے کو جائز قرار دیا ہے، چنانچہ اللہ رب العزت کا ارشاد ہے!

﴿قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ﴾

"پوچھو تو کہ زینت (وآرائش) اور کھانے (پینے) کی پاکیزہ چیزیں جو خدا نے اپنے بندوں کے لیے پیدا کی ہیں ان کو حرام کس نے کیا ہے"

لیکن مغربی تہذیب وتمدن کے دلدادہ لوگ اس کے متعلق کچھ نہیں جانتے اور اگر کچھ جانتے بھی ہیں تو ان کا یہ جاننا نہ جاننے کے برابر ہے کہ ان کو یہ سہولیات کس طرح حاصل ہوسکتی ہیں؟ اسی بنا پر وہ اسلام سے خوف زدہ ہیں اور اس کو ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور جب تک ہم اسلام کے سلسلہ میں ان کے اس خوف اور ناپسندیدگی کو دور کرنے کی کوشش نہیں کریں گے اور اس راہ میں کوتاہی کرتے رہیں گے یہ بات پیش آتی رہے گی کہ لوگ اسلام اور مسلمانوں کو ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھیں گے، بلکہ ہم اسلام کے داعیوں اور اس سے راہ فرار اختیار کرنے والوں کے درمیان آپسی کشمکش اور رنجشوں سے بھی دوچار ہوں گے۔

موجودہ زمانہ ایجادات واکتشافات کا زمانہ ہے اور آج رہنمائی اور پیغام رسانی اور اس کو دل ودماغ میں راسخ کرنے کے وسائل وآلات ایجاد ہوچکے ہیں اور غیر مسلم اس کو اپنے غلط مقاصد کے لیے خوب استعمال کررہے ہیں چنانچہ ان لوگوں نے اپنی تحقیقات وتالیفات اور اپنے نظام تعلیم اور نشریاتی اداروں کے ذریعہ لوگوں کے ذہنوں کو بگاڑ دیا ہے اور ان کے ذہنوں میں مذہب اسلام، شریعت اسلامی اور سیدنا محمد رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم سے نفرت پیدا کردی ہے، جب ہم کسی غیر اسلامی ملک کا سفر کرتے ہیں تو یہ دیکھتے ہیں کہ لوگوں میں کتابچے اور پمفلٹ تقسیم کرکے اور مکاتب و مدارس کا جال بچھا کر یہ مہم خوب چلائی جارہی ہے۔ اور جب ہم ان کتابی ذخیروں کو دیکھتے ہیں جن سے اسلام اور اسلامی تاریخ، اسلامی شریعت پر روشنی پڑتی ہے اور اس کا بغور مطالعہ کرتے ہیں تو محسوس کرتے ہیں کہ حقائق کو خلط ملط کرکے پیش کیا گیا ہے اور تحریف کی گئی ہے اور ان کتابوں سے ثابت ہوتا ہے کہ مذہب اسلام جہالت پر مبنی ایک پسماندہ مذہب ہے اور وہ زندگی کے مسائل کا ساتھ نہیں دیتا اور اس میں زمانہ کا ساتھ دینے کی صلاحیت نہیں ہے اس میں خواہشات نفس کی تکمیل کے لیے متعدد بیویوں سے شادی کرنے کی اجازت ہے اور شوہر کی نافرمانی کرنے کی صورت میں اس پر ظلم ڈھایا جاتا ہے اور مارا پیٹا جاتا ہے۔

ہم کو سیرت رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر لکھی گئی ایک کتاب کو بغور دیکھنے کا اتفاق ہوا جس کا مؤلف مشرقی علوم کا ماہر عالم ہے اس میں اس نے اپنی تحقیق اور مطالعہ کی روشنی میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ چونکہ محمد ایک غریب ملک میں پیدا ہوئے تھے اس لیے اپنے قبیلہ کو اور اسی کے ساتھ ساتھ سارے عرب کو فقر و فاقہ کی زندگی سے نکال کر دولت و ثروت کی طرف لانے کی کوشش کی اور مؤلف نے ایسے دلائل سے استدلال کیا ہے جس سے سادہ لوح لوگ دھوکہ کھا جائیں اور اس کتاب میں یہ بھی ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم صرف ایک سیاسی لیڈر یا قومی قائد تھے اور جس وقت ہم کسی غیر اسلامی ملک میں جاتے ہیں اور وہاں کے لوگوں سے اسلام کے متعلق کچھ ذکر کرتے ہیں تو وہ اپنی ناقص معلومات اور بدگمانیوں کی وجہ سے حیرت زدہ رہ جاتے ہیں، وہ لوگ اپنی بدگمانیوں کی وجہ سے سمجھتے ہیں کہ اسلام اپنے پیروکاروں کے ساتھ مشکل ترین اور انتہا پسندانہ رویہ اختیار کرتا ہے اور ان کے ذہنوں

میں یہ تصور جاگزیں ہوتا ہے کہ اسلام ایک تنگ نظر دین ہے اور پسماندہ دور کی طرف لوٹنے کا حامی ہے اور یہ مذہب عصر حاضر سے بالکل مناسبت نہیں رکھتا اور نہ ہی اس کا ساتھ دینے کی صلاحیت رکھتا ہے، یہ تو غیر مسلم ممالک کی حالت تھی لیکن جہاں تک ان ممالک کا تعلق ہے جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے اور وہاں انہیں قیادت وسیادت حاصل ہے وہاں بھی موجودہ ثقافت اور تہذیب وتمدن کے پروردہ لوگوں کی کثیر تعداد ہے جن کے ذہنوں میں اس سے ملتے جلتے تصورات موجود ہیں۔

اس طرح کی صورت حال پیدا ہونے میں ہماری کوتاہیوں اور ہماری غلطیوں کا بڑا دخل ہے کہ ہم نے صحیح صورت حال کا جائزہ نہیں لیا اور اس میں اس بات کو بھی دخل ہے کہ ہم نے اس بات کی طرف بہت کم توجہ دی ہے کہ جن لوگوں کے دلوں میں اسلام سے بدگمانی ہے ان کے سامنے اسلام کی سچی تصویر اور اس کی روشن تاریخ کو اس کی نفع بخش شکل میں پیش کریں ہم نے اسلام سے ناواقف لوگوں کو اسلام کی صحیح تعلیمات سے روشناس کرنے والے پمفلٹ اور کتابچے بھی ان کو پہنچانے کی کوشش نہیں کی اور نہ اس بات کی فکر کی کہ غیر مسلم حلقوں میں ایسے سیمینار کیے جائیں جن سے اسلام سے ناواقف لوگوں پر اسلام کا امتیاز اور تفوق جو اسے دوسرے مذاہب پر حاصل ہے روشن اور عیاں ہو جائے اور یہ بات بھی ان کے سامنے آشکارا ہو جائے کہ مذہب اسلام فطرت انسانی سے کس قدر قریب ہے اسی طرح ہم نے غیر اسلامی ممالک اور اسلامی ممالک میں ذرائع ابلاغ کو استعمال کرنے کی طرف بھی توجہ نہ دی اور اس میدان میں ہماری جدوجہد نہ ہونے کے برابر ہے، ہم اپنے ذاتی فائدہ اور خواہش کی تکمیل پر بے انتہا روپے صرف کرتے ہیں لیکن اجتماعی مصالح اور دعوتی اور ادبی وعلمی وسائل پر بہت کم خرچ کرتے ہیں۔

اور جہاں تک تعلیمی میدان کا مسئلہ ہے تو اس میں ہمارے ان فارغین کی تعداد جو کسی علمی اور انتظامی شعبہ میں کوئی اہم ذمہ داری سنبھال سکیں اور اس کے ساتھ ساتھ ان کو اسلامی احکام کا صحیح علم ہو اور اسلام کی روحانیت سے واقف ہوں اور بقدر ضرورت ان کے اندر ملکی سیاست کی صلاحیت بھی موجود ہو ان کے مقابلہ میں بہت کم ہے جو مغربی ممالک کی یونیورسٹیوں اور اداروں سے فارغ ہوتے ہیں ان میں سیکڑوں اور ہزاروں مختلف میدانوں کے ماہر ہوتے ہیں اس کے باوجود انہیں نہ تو اسلام کے بارے میں معلومات ہیں اور نہ ہی وہ اس کے احکام اور اس کی اصلی روح سے واقف ہیں، ہم کوششیں ان انشاء پردازوں پر کیوں نہ صرف کریں جو علمی اکتشافات اور تحقیقات کا کام انجام دیں اور بہت واضح اسلوب اور فصیح و بلیغ زبان میں تصنیف و تالیف کریں جن کو اہل زبان پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھیں اور پڑھنے میں بھی بھلی معلوم ہوں اور اس میں وہ اسلامی حقائق کو دلکش پیرائے اور اچھے اسلوب میں پیش کریں۔ جن کی طرف پڑھنے والوں کا دل خود بخود کھنچنے لگے۔

یہی معاملہ صحافت اور ذرائع ابلاغ کا ہے، ہم ان دونوں میدانوں میں بہت پیچھے ہیں ہم اسے فقط علاقائی کھپت اور خواہشات کی تکمیل کے لئے استعمال کرتے ہیں اور ہمارے مخالفین اسے اپنے مقاصد کی تکمیل اور ذہنی تربیت کے لئے استعمال کرتے ہیں، بلاشبہ یہ ایک مشکل اور محنت طلب کام ہے لیکن اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے علاوہ دوسرے لوگ ہمیں صحیح شکل وصورت میں پہچان سکیں اور اس بات کے قائل ہو جائیں کہ اسلام آج کی موجودہ زندگی میں ہمارا ساتھ دینے کی صلاحیت رکھتا ہے تو ہمیں ان چیزوں کو اختیار کرنا لازمی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ ہم مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد کو حقیقی اسلام کی

طرف لانے اور اسلامی قوانین کو زندگی کے ساتھ منطبق کرنے کے سلسلہ میں انھیں بیدار کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں اور یہ ایک قابل اطمینان بات ہے اس کا فائدہ اور نتیجہ بہت جلد ہمارے سامنے آئے گا، ہم سے ایسی طاقت بحال کرنے والے میدانوں میں بڑی کوتاہی ہوئی ہے جو اسلامی زندگی کے قیام کے لئے ضروری ہے جس کی وجہ سے اس بات کا اندیشہ ہے کہ کہیں مسلمانوں کے فکری رہنماؤں کی اسلامی بیداری کے لئے کی گئی کوششیں رائیگاں نہ چلی جائیں اور یہ پہلو بھی اتنا اہم ہے کہ اس کی جانب توجہ دینے کی بڑی ضرورت ہے جب ہم اس کی طرف توجہ دیں گے تب اسلامی بیداری کی ہماری یہ کوششیں برگ وبار لائیں گی اور ایک ہمہ گیر اور لوگوں میں مقبول اسلامی نظام قائم ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ ﴾ (نحل:۱۲۵)

''(اے پیغمبر) لوگوں کو دانش اور نیکی کی نصیحت سے اپنے پروردگار کے راستے کی طرف بلاؤ اور بہت ہی اچھے طریق سے ان سے بحث کرو۔''

اسلام اور مسلمانوں کا دفاع

علماء و قائدین کی اہم ذمہ داری

ہر زمانہ میں حالات اور وقت کے تقاضے کے مطابق اسلامی خدمات کے طریقے الگ الگ رہے ہیں، اور علماء اسلام کی ذمہ داریاں بھی بدلتی رہیں، آج کے اس دور میں غیر مسلموں کے ذہن میں اسلام کی اثر پذیری، اس کی قائدانہ صلاحیت اور نوعِ انسانی کی فلاح و بہبودی کے لئے اسکے اعلیٰ اخلاقی تعلیمات کے بارے میں طرح طرح کے شکوک وشبہات پیدا ہو گئے ہیں یا کر دیئے گئے ہیں، اور اسلام کو سمجھنے کی راہ میں شکوک وشبہات کی یہ دیوار جب تک حائل ہے نفاذ اسلام کی کوششیں جو مختلف اسلامی تحریکوں اور جماعتوں کی طرف سے ہو رہی ہیں بار آور نہیں ہو سکتی ہیں۔ اس لئے عالمِ اسلام کی سب سے اہم ذمہ داری آج یہ ہے کہ وہ ان شکوک وشبہات کو دور کرے جو غیر مسلموں کے ذہن میں راہ پا گئے ہیں۔

آج اسلام دشمن عناصر کی کثرت ہے جو سیاسی اور مادی قوتوں سے لبریز اور ابلاغ وارسال کے وسائل سے لیس ہے، علاقائی اور قومی صحافت سے لے کر بین

الاقوامی پریس تک پر وہ اپنا تسلط جمائے ہوئے ہیں اور مختلف قسم کی پروپیگنڈائی مشنریاں ان کے ماتحت ہیں، عالمی سیاست پر اثر انداز ہونے کے جتنے بھی ذرائع ہو سکتے ہیں وہ ان سے کام لے رہے ہیں، اور ان سب کے لئے بنیادی چیز جو دولت ہے ان کے پاس اس کی بھی فراوانی ہے، یہی وجہ ہے کہ جب وہ اسلام اور مسلمان کے کارناموں پر پردہ ڈالنا چاہتے ہیں، یا اسلام کے خلاف گمراہ کن خیالات کو عام کرنا چاہتے ہیں اور اسلام کے بارے میں تشکیک وارتیاب کی کیفیت لوگوں کے ذہن میں پیدا کرنا چاہتے ہیں تو وہ اس میں پورے طور پر کامیاب ہوتے ہیں، یہ ایک فطری بات ہے کہ جب انسان کے سامنے بار بار کوئی بات دہرائی جائے، اور مختلف اسلوب اور مختلف انداز میں کسی مذہب یا کسی قوم یا کسی نظریہ کے بارے میں کہا جائے کہ وہ انسانیت کے لئے تباہ کن ہے، وہ بنی نوع انسان کو ذلت وپستی کے مہیب غار کی طرف لے جاتا ہے تو لوگ نہ صرف یہ کہ اس مذہب کو قبول کرنے سے گریز کریں گے بلکہ اس مذہب اور مذہب کے پیروؤں کو برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں ہوں گے، وہ کبھی اس بات کو گوارہ نہیں کریں گے کہ دنیا میں اس کا نفاذ ہو سکے اور مسلم وغیر مسلم سبھی اس کے ظالمانہ قانون کے شکنجے میں آجائیں۔

مغربی ممالک کے لوگوں کے سامنے اسلام کا ایسا ہی نقشہ پیش کیا جاتا ہے اور اسلام کے بارے میں یہی تھیوری (Theory) ان کے سامنے بار بار دہرائی جاتی ہے۔ وہ اسلام کے بارے میں وہی پڑھتے اور جانتے ہیں۔ جو اسلام دشمنوں کی طرف سے اسلام کے بارے میں لکھا جاتا ہے۔ جس کے لکھنے والے یا تو اسلام سے بالکل ناواقف ہوتے ہیں یا جان بوجھ کر اسلام کے خلاف افتراء پردازی کرتے ہیں اور مغربی ذرائع ابلاغ اسلام کے خلاف ان بہتان تراشیوں کی تبلیغ بڑے زور وشور کے ساتھ کرتے ہیں اور لوگ ان کو تسلیم بھی کر لیتے ہیں، اس لئے کہ مغربی یا

مشرقی ممالک میں غیر مسلموں کو جن مسلمانوں سے سابقہ پڑتا ہے ان کے کردار سے اسلام کا روشن پہلو ان کے سامنے نہیں آپاتا ہے، اور خود اسلامی ممالک میں مسلمانوں کا معاشرتی نظام اس قدر بگڑ چکا ہے کہ ایک اجنبی شخص اس کے بارے میں اچھا تصور قائم نہیں کرسکتا ہے، ایسی صورت حال میں کیا غیر مسلموں سے اس بات کی توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ مسلمانوں کے بارے میں اچھی رائے قائم کریں گے۔ اور اسلام کی اعلیٰ تعلیمات سے متاثر ہوں گے؟ جب اسلامی نظریات سے وہ مطمئن نہیں ہونگے اور اسلام قیادت کے منصب پر فائز ہونا چاہے گا تو ظاہر ہے وہ مخالفت پر اتر آئیں گے اور کبھی یہ نہیں چاہیں گے کہ جس نظریہ کو وہ پسند نہیں کرتے ہیں زبردستی وہ ان پر تھوپا جائے۔

مسلمانوں کی سماجی، اخلاقی اور دینی اصلاح کے لئے یقیناً مختلف انداز میں کچھ کوششیں ہورہی ہیں اور کسی حدتک پاکیزہ اسلامی صحافت بھی، صحیح اسلامی معاشرہ کی تشکیل اور غیر مسلموں کے ذہن سے شکوک وشبہات کو دور کرنے کے لئے حتی الوسع کوششیں کررہی ہے، لیکن اس سمندر میں اس کی بساط ہی کیا ہے۔ خود مسلمانوں کے اندر بھی اس کا دائرہ بہت محدود ہے، اور غیر مسلموں میں تو دور دور اس کی آواز ہی نہیں جاتی ہے۔ دوسری طرف اسلامی تحریکیں اور جماعتیں ہیں جو اسلام کی عظمت رفتہ کی بازیابی کے لئے اپنی مخصوص حکمت عملی کے تحت کام کررہی ہیں، جو فائدہ سے خالی نہیں ہے، اور زندگی کے کسی نہ کسی دائرہ میں اس کی تاثیر محسوس کی جارہی ہے لیکن تحریکوں کی سرگرمیوں کے سامنے یہ ایک سوالیہ نشان ہے کہ وہ موجودہ پُرفریب رجحانات سے متاثر زندگی پر کس حدتک اثر ڈال رہے ہیں؟ ان کی کوششوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی حکمت عملی محض غیر مسلموں یا صرف نام کے مسلمانوں کے ہاتھوں سے اقتدار چھین لیا جائے یا ان کو اقتدار سے خود دست کش

ہونے پر مجبور کر دیا جائے، لیکن کیا ان اسلامی رہنماؤں کو اس کی توقع ہے کہ وہ اپنے دشمن کو اس کے لئے رام کر لیں گے، اور ان کے دشمن آسانی کے ساتھ اپنی ساری قوت وسطوت کے باوجود ان کے سامنے سپر ڈال دیں گے، جبکہ قوت وتدبیر میں وہ ان اسلام پسندوں سے فائق ہیں اسلامی فکر اور اصحاب فکر کو سخت ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، اور گمراہ کن مغربی ذرائع ابلاغ نے عوام الناس کے ایک بڑے طبقہ کو ان کا ہم خیال بنا دیا ہے۔ اور خود جدید تعلیم یافتہ مسلم طبقہ اسلامی فکر اور اصحاب فکر کو اپنی تنقید کا نشانہ بنانے میں ان کے نقش قدم پر چل رہا ہے۔

ایسی صورتحال میں ہم اپنے مقصد میں کیسے کامیاب ہو سکتے ہیں جبکہ داخلی وخارجی دونوں طرح کے دشمنوں سے ہم گھرے ہوئے ہیں۔ اور اگر کسی ملک یا شہر میں اس طرح کی کوئی تحریک کسی طرح اپنے مقصد میں کامیاب بھی ہو گئی، اور اسلام مخالف طاقتوں کو قیادت سے ہٹا کر اس پر غالب ہو گئی تو کیا وہ اس ملک یا سماج کو صحیح اسلامی خطوط پر تشکیل کرنے اور اس کی ہیئت انتظامیہ اور عامہ میں دوررس تبدیلی لانے میں بھی کامیاب ہو جائینگی، اور اس کام کے لئے جس اخلاص اور اہلیت کی ضرورت ہے اس کے حامل ضرورت کے مطابق اصحاب کمال لوگ انہیں میسر ہو جائیں گے؟ جب تک ایسے مخلصین نہ ہوں اور جماعت کے اندر عوام کے ذہنوں کو بدلنے کی صلاحیت نہ ہو اس وقت تک صرف قیادت میں تبدیلی لانے میں کوئی بڑا اور دوررس فائدہ نہیں ہے، بلکہ آج کی اولین ضرورت یہ ہے کہ اسلام کی نافعیت کے بارے میں رائے عامہ کو ہموار کیا جائے، اسلام کی صلاحیت اور اس کی معنویت کو دنیا کے سامنے منوانے کی کوشش کی جائے۔

اس خیال کو دور کیا جائے کہ اسلام انسانیت کی نہیں، وحشت وبربریت کی تعلیم دیتا ہے، اور اس کی کامیابی انسانیت کے لئے موت ہے، کیونکہ اسلام دشمن

عناصر اسلام کو بدنام کرنے اور اس کو ناکام ثابت کرنے کے لئے اس قسم کے خیالات کی ترویج واشاعت میں اپنی ساری توانائی صرف کر رہے ہیں، اور اپنے گمراہ کن خیالات کی تائید میں مسلمانوں کی اجتماعی اور انفرادی زندگی کے معاملات اور ان غلط اعمال وافعال کو بطور دلیل کے پیش کرتے ہیں، دوسری طرف مسلمانوں کا معاملہ یہ ہے کہ وہ اسلام کے فضائل اور اس کے اعلیٰ اخلاقی تعلیمات کی ترویج واشاعت میں کوئی خاص دلچسپی نہیں لے رہے ہیں۔ اس کی حقانیت، قائدانہ صلاحیت اور اس کو انسانیت کے لئے رحمت ثابت کرنے کے لئے کوشش نہیں کر رہے ہیں۔ اور نہ علم، تہذیب، تمدن، سیاست، حکومت اور اخلاقی کردار کے میدانوں میں اس کے متبعین کے روشن کارناموں کو اس طرح پیش کیا جو ان کا حق تھا۔ بلکہ بسا اوقات ان کے غیر مسلم پڑوسی ان کے مذہب کے فضائل اور اخلاقی تعلیمات سے باوجود قریب ہونے کے بالکل ناواقف ہوتے ہیں۔

مغربی ممالک میں بسنے والے غیر مسلم لوگ ہم مسلمانوں، خصوصاً عربوں پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ وہ رجعیت پرست اور وحشی ہوتے ہیں جنکی زندگی کا مقصد صرف زیادہ سے زیادہ شادیاں کرنا اور طلاق دینا ہے۔ عورتوں پر ظلم ڈھانا، ان کو انسانی حقوق سے محروم کرنا ان کا طرۂ امتیاز ہے، خونریزی ان کا محبوب مشغلہ ہے، لیکن تعلیم یافتہ مسلمان اور اہل ثروت عرب بجائے اس کے کہ ان کی اس غلط فہمی کو دور کریں، مغربی صحافت کے ان پروپگنڈوں کو بے بنیاد ثابت کریں۔ وہ مغربی مفکرین اور مغربی اہل قلم کے خیالات وافکار پر فریفتہ ہوتے رہے ہیں۔ وہ انہیں اپنا اتالیق تسلیم کرنے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ ان کو اخلاص اور انسانیت کا کامل نمونہ تصور کرتے ہیں۔ ایک طرف یورپ مسلمانوں کی تذلیل وتوہین میں کوئی کسر باقی نہیں رکھ رہا ہے اور دوسری طرف یہ سادہ لوح مسلمان یورپ کی منڈیوں میں

اپنے پیسے بے دریغ صرف کر کے اس کی معیشت کو مستحکم کر رہے ہیں۔ چھٹیوں میں بڑی تعداد میں عرب نوجوان یورپ کے شہروں کا رخ کرتے ہیں اور اپنے ملک کا پیسہ پانی کی طرح وہاں بہاتے ہیں۔ برطانیہ اور بہت سے مغربی ممالک کی اقتصادی ترقی میں ان زائرین نے نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ حالانکہ اسی مغرب نے اپنی سامراجی سیاست کی وجہ سے عربوں کے امن وسکون کو چھین لیا ہے، عالم عربی کے قلب میں یہودی ریاست قائم کر کے دائمی جنگ وجدال کا بیج بو دیا ہے۔ اسی طرح برصغیر کے غیر مسلموں کے ذہنوں کو اسلام کے خلاف خوب مسموم کیا جا چکا ہے ان کو یہ سمجھا دیا گیا ہے کہ مسلمان گندے اور ناپاک ہوتے ہیں، عورتوں کے حقوق پامال کرتے ہیں اور ان پر ظلم کرتے ہیں۔ حالانکہ ایک معمولی واقفیت رکھنے والا شخص بھی اس بات کو سمجھتا ہے کہ نجاست اور طہارت کے سلسلہ میں دونوں کے طرزِ عمل میں کیا فرق ہے۔ عورتوں کے ساتھ کس کے یہاں کیا سلوک ہوتا ہے؟ اس ذہنیت کے بدلنے کی ذمہ داری کس پر عائد ہوتی ہے؟ مسلمانوں نے ہندوستان پر سات صدی تک حکومت کی لیکن غیر مسلم ان سات صدیوں کے بارے میں کیا جانتے ہیں، یہ کہ یہ دور قتل و غارت گری اور ظلم و استبداد کا دور ہے جس میں غیر مسلموں کی عبادت گاہوں کو ڈھایا گیا۔ اور ان پر مسجد کی تعمیر کی گئی، اس غلط فہمی اور بدگمانی کو ختم کرنے کی ذمہ داری کس کی ہے؟ کیا تعلیم یافتہ مسلمان اس کے مکلّف نہیں ہیں کہ غیر مسلموں کے ذہن سے ان شکوک وشبہات کو دور کریں، پوری دنیا میں اسلام دشمن صحافت، اسلام کے خلاف جو زہر اگل رہی ہے اس کا تریاق فراہم کریں۔ ان کے پروپگنڈوں کو بے بنیاد ثابت کریں۔ لیکن افسوس کہ اسلام اور مسلمانوں کے دفاع کا یہ اہم مورچہ اسلام کے بلند ہمت سپاہیوں سے خالی ہے۔

دعوتی کام امت مسلمہ کے تحفظ وبقا کا ضامن

امت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والتسلیم کو اپنے سے پہلے کی مسلمان امتوں پر یہ امتیاز حاصل ہے کہ سابقہ امتوں میں انبیاء علیہم السلام کے بھیجے جانے کا سلسلہ قائم تھا۔ اللہ تعالیٰ ایک نبی کے بعد دوسرا نبی بھیجتا تھا جو دین صحیح کی دعوت کا کام کرتا تھا۔ ہر نبی کے امتی اپنے نبی کے کام میں ہاتھ بٹاتے تھے اور دعوتِ دین کے کام میں شرکت کرتے تھے، لیکن حضور مقبول حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نبیوں کا بھیجا جانا موقوف کیا گیا اور وہ کام جو پے در پے نبی بھیج کر کرایا جاتا تھا، اس کی ذمہ داری امت محمدیہ کے سپرد کی گئی، چونکہ آخری نبی کے آجانے سے دین مکمل ہو گیا اس کی رو سے آخری نبی کے لائے ہوئے آخری پیغام خداوندی کو قیامت تک جاری رہنا ہے اس لئے اب جو کام ہونا تھا وہ اسی دین کے اندر ہونا تھا لہٰذا اس کے لئے اب آپ کے بعد قیامت تک کی نیابت آپ کی امت کے سپرد کی گئی، قرآن مجید میں حکم آیا:

﴿وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ أُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُوْنَ

بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ط وَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ﴾ (آل عمران۔۱۰۴)

''تم میں ضرور ایک امت یعنی ایک بڑی تعداد میں لوگ ہونے چاہئیں جو دعوت الی الحق کا کام کریں اچھی بات کا حکم دیں، بری بات سے منع کریں اور یہی لوگ کامیاب ہوں گے۔

اور فرمایا:

﴿كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ﴾ (سورۃ آل عمران:۱۱۰

''تم واقعتاً بہترین امت ہو جو لوگوں یعنی سب انسانوں کے لئے بھیجی گئی ہو۔ تم اچھی بات کا حکم دیتے ہو اور بری بات سے منع کرتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔''

اس آیت میں قابل توجہ بات یہ ہے کہ اس کام پر امت کے افراد کو باقاعدہ مامور کیا گیا ہے نیز فرمایا کہ تم اللہ پر ایمان رکھتے ہو اور فرمایا تم بہترین امت ہو اور تمام انسانوں کے لئے مامور کئے گئے ہو، اس سے ظاہر ہوا کہ اس کام پر امت کا مامور ہونا پھر بہترین جماعت و امت ہونا پھر ایمان کی صفت سے باقاعدہ متصف ہونا تین خاص پہلو ہیں جن کو نمایاں فرمایا گیا ہے۔

یہ وہ ذمہ داری ہے جو امت محمدیہ کے لئے تمغۂ امتیاز ہے، لیکن یہ اسی وقت صحیح اور مطابق واقعہ ہوگا جب مسلمان اپنی ذمہ داری کو پورا کریں اور یہ ذمہ داری دینی دعوت کے کام کے انجام دینے کی ہے۔ الحمدللہ مسلمانوں کے ہر دور میں اور ہر

ملک میں یہ کام کسی نہ کسی مقدار میں انجام دیا جاتا رہا ہے، بس فرق اگر کوئی ملے گا تو اس کی کمی وبیشی کا اور قرآنی اشاروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کام میں کمی وبیشی کی بنیاد پر اس امت کے فروغ وعزت میں کمی وبیشی ہوتی رہی ہے۔ چنانچہ جب اور جہاں دعوت کا کام ڈھیلا پڑا اور کم ہوا یا متروک ہوا وہاں اسی کے اعتبار سے مسلمانوں کی عزت ومقام کا حال بنا۔

اندلس جو ایک جنت ارضی کے مانند تھا اور جہاں مسلمانوں کی علمی و دعوتی ترقی اس معیار کو پہنچی تھی کہ اس وقت کی ساری دنیا اس کو دیکھ کر مرعوب و متاثر تھی اور یورپ کی موجودہ علمی و مادی ترقیات کا آغاز وہیں کی خوشہ چینی سے ہوا، جس کو تمام ماہرین تاریخ علمی وتمدن مانتے ہیں، وہاں کے مسلمانوں نے سب کچھ کیا تھا، لیکن دعوتی فریضہ انجام دینے میں کمی کی تھی۔ چنانچہ وہ وہاں آخر تک اپنی چھوٹی تعداد میں رہے اور جب اکثریت واقلیت کے اصول کے دائرۂ اثر میں آئے تو اولاً مجبور ومقہور ہوئے پھر بالآخر ملک سے ہجرت کرنا پڑی۔ لیکن برصغیر ہند و پاک میں اگرچہ اندلس ہی کی طرح مسلمانوں کی حکومت سات سو سال رہی اور یہاں حکمرانوں نے عوام کو اپنا ہم نوا بنانے کے لئے طرح طرح کے سیکولر طریقے بھی اختیار کئے حتیٰ کہ بعض بادشاہوں نے یہاں اکثریتی عوام کے مشرکانہ مذہب کی متعدد باتوں کو اسلام میں ملا کر ایک مشترک مذہب بھی بنایا مزید یہ کہ یہاں اکثریتی مذہب کے اہم لوگوں میں خسر وداماد کے رشتے بھی قائم کئے لیکن اس کا نتیجہ غیروں کی طرف سے بجائے قدردانی کے آج یہ ہے کہ خوب گالیاں مل رہی ہیں اور مسلمان بادشاہوں کو ہندوؤں پر ظلم وتعدی کا مرتکب بتایا جا رہا ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ ساتھ یہاں اندلس کے برعکس دین کے علمبرداروں اور داعیوں نے اپنی جگہ ملک میں پھیل پھیل کر دنیاوی اور سیاسی منافع سے الگ

رہتے ہوئے جم کے دعوت کا کام کیا۔ آج انہی کی برکت ہے کہ اس برصغیر میں مسلمانوں کی اچھی پوزیشن ہے اور دینی وعلمی کام ہے اور انہی کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ جب کہ اس برصغیر میں باہر سے آنے والے مسلمانوں کی تعداد کل ملا کر چالیس ہزار سے زیادہ نہیں بنتی لیکن ان کی اب اس برصغیر میں تعداد چالیس بیالیس کروڑ ہے۔ ۱۳-۱۴ کروڑ ہندوستان میں ۲۶-۲۷ کروڑ پاکستان و بنگلہ دیش میں یعنی باہر سے آنے والوں کو دیکھتے ہوئے ایک اور دس ہزار کا فرق رکھتی ہے یعنی ایک آدمی اگر باہر سے آیا ہوا ہوگا تو ۹ ہزار ۹ سو ۹۹ یہیں اسی ملک کے ہیں ان میں سے کچھ تو وہ ہوں گے جو باہر سے آنے والوں کی نسل سے ہیں لیکن اکثر و بیشتر وہ لوگ ہیں جو اسلام کی محبت وانسانیت نوازی کی اداؤں کو دیکھ کر حلقہ بگوش اسلام ہونے والوں کی اولاد ہیں دین کے علمبرداروں اور داعیوں کی بے غرض کوششوں کے اثر سے آج اس برصغیر میں مسجدوں کی تعداد لاکھوں کی ہو چکی ہے اور مدرسے و مکاتب ہزاروں کی تعداد میں ہیں جن سے علم و دین کی شعاعیں قریب و دور پھیلتی رہی ہیں حتیٰ کہ ان کا فیض برصغیر سے نکل کر ایشیا کے شمالی و وسطی و مشرقی ملکوں تک پہنچتا رہا ہے اور امت اسلامیہ کے علوم دینیہ و ثقافیہ میں ان مسلمانوں کا جو وقیع حصہ ہے وہ بھی قابل فخر ہے، دعوت کا کام مسلمانوں کی اصل امتیازی خصوصیت بقاو ترقی سے وابستہ ہے اس امتیازی خصوصیت میں جب بھی کمی ہوگی وہ نقصان کا باعث ہوگی۔

یہ خوش آئند بات ہے کہ برصغیر میں الحمدللہ دعوت کے کام میں اب بھی مسلمانوں کی ایک تعداد مصروف ہے۔ ان کے میدان عمل اور طریقہ کار میں تنوع ہے ان کے ذریعہ دین کے تعارف، ایمان وعمل صالح کی تلقین کا کام انجام دیا جا رہا ہے، اس میں سے زیادہ وسیع اور عوامی کام جماعت تبلیغ کا ہے جو شہروں،

دیہاتوں اور کوردہ سے کوردہ مقام تک پہنچا ہوا ہے، ملک سے باہر دنیا کے بیشتر ملکوں تک سفر کر کے اس کے داعی پہنچتے ہیں خود اپنا خرچ کرتے ہیں، محبت و ہمدردی کے ساتھ لوگوں سے ملتے اور بے غرض رویہ کے ساتھ کام کرتے ہیں، اسی کا نتیجہ ہے کہ ان کے کام کے اثرات بھی اب غیر معمولی ظاہر ہو رہے ہیں، نہ معلوم کتنے ایسے افراد ہیں کہ دعوت کے ان تک پہنچنے سے قبل مختلف قسم کے حرام کاموں میں اور خدا بیزار زندگی میں مبتلا تھے وہ دعوت کا اثر قبول کرنے کے بعد نہ صرف یہ کہ نہایت صالح مسلمان بنے، بلکہ پرہمت اور منہمک داعی بنے ہوئے ہیں۔ لاکھوں آدمی جو آزادانہ زندگی میں مبتلا رہ چکے ہیں وہ اب دیکھنے میں مولوی ملا اور عملی طور پر دینی زندگی میں سرشار نظر آتے ہیں۔

یہ سب نتیجہ ہے دعوتی زندگی اختیار کرنے کا اور اللہ تعالیٰ کے حکم و دعوت کی تعمیل کا، اللہ تعالیٰ نے چاہا تو دعوت کی یہ کوششیں جو بے غرض طریقہ سے کی جا رہی ہیں، خواہ جماعت تبلیغ کی ہوں خواہ دوسری دعوتی عمل رکھنے والی جماعتوں کی ہوں امت مسلمہ کی حفاظت و ترقی کے بہترین نتائج پیدا کریں گی اور کم از کم اس امت کے بقا و تحفظ کا ذریعہ ثابت ہوں گی۔

ہمارا کردار غیر مسلموں میں

پندرہویں صدی کے آغاز پر متعدد اہل فکر مسلمانوں نے یہ خیال ظاہر کیا کہ یہ صدی اسلام کی صدی ہوگی یعنی اس میں مسلمان قوتوں کو فروغ حاصل ہوگا، اور مسلمان ابھر کر دوسری قوموں کے مقابلہ میں اٹھیں گے اور عظیم طاقت بنیں گے۔

اس خیال کے لوگوں کے سامنے دنیا میں مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی تعداد، جگہ جگہ نوجوان مسلم طاقتوں کا زور اور دنیا کے متعدد حصوں میں سب کی توجہ مسلمانوں پر مرکوز ہو جانا تھا، ان باتوں کو انہوں نے مسلمانوں کے شاندار مستقبل کی علامت محسوس کیا۔

ان کا یہ خیال کہاں تک صحیح ہے اس کو تو مستقبل بتائے گا، باقی یہ ضرور ہے کہ ہم کو عالم اسلام کے اندر مسلمانوں کی روز افزوں بیداری کا جائزہ لیتے رہنا چاہئے، اور اس میں اچھے پہلوؤں سے حوصلہ و امنگ حاصل کرنا چاہئے اور غلطیوں کے حامل پہلوؤں سے سبق لینا چاہئے اور اپنی حکمتِ عملی میں ان سے بچنے کی صورت شامل کرنا چاہئے۔

مسلمانوں کی اجتماعی زندگی، دعوت کے عمل اور جہاد کے عمل پر مشتمل ہے

اور دونوں کے لئے جناب رسول اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ سے پوری روشنی ملتی ہے اور اسی سے رہنمائی اور طاقت حاصل کرنا ہے، اپنے ذاتی رجحان پر نہیں لیکن عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ غیروں سے ہم کو جو تکلیفیں پہنچیں، اور طاقتور دشموں سے جو اذیتیں پہنچیں، انہوں نے ہم میں ایک ردِ عمل پیدا کر دیا جو انتقامی جذبہ کی صورت میں جگہ جگہ ظاہر ہو رہا ہے، انتقام لینا ہر مظلوم کا حق ہے اور اگر مظلوم میں انتقامی کیفیت پیدا ہوئی تو اس کے اس طرز عمل کو بغاوت کی بات سمجھی جائیگی، اور مظلوم کو اسلام کی طرف سے انتقام کا پورا حق دیا گیا ہے، لیکن اس کے ساتھ یہ صحیح نہیں کہ انتقامی جذبہ میں خطا کار اور بے خطا کار کا فرق نہ کیا جائے، اور ظالم سے غصہ ہو کر اس سے تعلق رکھنے والے ایسے شخص پر بھی غصہ اتار دیا جائے جس نے ظلم نہیں کیا۔ پھر یہ دیکھنا عقل کی بات ہے کہ انتقام لے لینے اور غصہ اتار لینے کے علاوہ بھی کوئی دوسری بات نفع بخش ہو سکتی ہو تو اس پر بھی غور کیا جائے اور اختیار کرنے کے لائق ہو تو اختیار کیا جائے اور ظالم کا مطالعہ کیا جائے، اور یہ دیکھنے کی کوشش کی جائے کہ اس کے ظلم کے نیچے کوئی ایسا سبب تو نہیں جس کا تعلق ہماری کسی کمزوری یا غلطی سے ہو۔

نبی آخر الزماں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دین کا کام دعوت سے شروع کیا۔ اور دعوت میں اللہ تعالیٰ کی ربوبیت و وحدانیت کو تسلیم کرایا اور بندگی کے تقاضے پورا کرنے کے ساتھ ساتھ عام انسانی ہمدردی اور مکارم اخلاق کو وطیرہ بنایا، یہی وجہ تھی کہ لوگوں کو آپ کی دعوت سے اختلاف بلکہ مخالفت کے باوجود آپ سے ہمدردی تھی جو آپ کو امانت دار، سچا، اور نیک طبیعت سمجھنے کے واقعات سے ظاہر ہے۔ ابو جہل نے ایک بار آپ کو سخت زبانی ایذا پہنچائی، آپ نے موقع ایسا محسوس کیا کہ سخت لفظ استعمال فرمائے۔ آپ نے فرمایا کہ میں وہ بات لایا ہوں کہ جس کے ذریعہ تم لوگ کٹو گے، اس پر لوگ یہ کہنے لگے، محمد صاحب آپ تو نادرست اور

ناگوار رویہ اختیار نہیں کیا کرتے تھے، یعنی دشمنوں نے شہادت دی کہ آپ کا رویہ عموماً صبر کا رہا۔

آپ جہاں نرم اور متحمل تھے کہ آپ کے دشمن بھی یہ کہیں کہ آپ ایسا سخت رویہ اختیار نہیں کرتے تھے وہاں یہ بات بھی تھی کہ جہاد وقتال کا موقع آیا تو آپ نے اپنے ہاتھ سے بھی ضرب وقتال کئے، اور اس میں کوئی ڈھیلا پن نہیں اختیار کیا، آپ کی مکی زندگی اپنا علاحدہ رنگ رکھتی ہے اور مدنی زندگی علاحدہ رنگ اور دونوں میں کبھی کبھی وہ لمحات بھی آئے جس میں طرز مختلف ہو جاتا، یہ سب موقع ومحل کا لحاظ رکھنے اور مقصد پر نظر رکھنے کی وجہ سے ہوتا تھا، چنانچہ طائف جب آپ ہمدردی حاصل کرنے کے لئے تشریف لے گئے اور وہاں ہمدردی نہیں ملی، بلکہ نہایت غیر انسانی طریقہ سے آپ کو مایوس کیا گیا اور اذیت پہنچائی گئی تو اس پر خدائے تعالیٰ کی رحمت جوش میں آئی اور ایک فرشتہ بھیجا گیا کہ آپ کہیں تو پہاڑوں کے درمیان یہ رہتے ہیں پہاڑوں سے دبا دیے جائیں آپ نے دکھے دل کے باوجود یہ فرمایا کہ نہیں اگر یہ نہیں تو ان کی اولاد حلقہ بگوشِ اسلام ہو جائے گی۔

ہم اگر مسلمانوں کے درمیان رہ رہے ہیں تو ہماری کیا ذمہ داری ہے؟ اور اگر غیر مسلموں کے درمیان ہیں تو ہماری کیا ذمہ داری ہے؟ رواداری برتنے کے حالات کون سے ہیں اور انتقامی جذبہ اختیار کرنے کے کون سے ہیں؟ پھر یہ دیکھنا کہ محض دشمن کی شر پسندی سے حالات میں خرابی ہے یا ہماری کوتاہی اور بے توجہی کو بھی دخل ہے، ان باتوں پر نظر رکھتے ہوئے طریقۂ عمل اختیار کرنا سمجھداری ہے۔

ان باتوں کا اگر ہم منصفانہ جائزہ لیں تو کم از کم ہندوستان کے اس ملک میں ہماری کوتاہی کا بھی اچھا خاصا حصہ نکلے گا، ہم نے اسلام کی تعلیمات کو واضح کرنے اور

مسلمانوں کے انسانیت دوستی کے کردار کا مظاہرہ کرنے میں بڑی کوتاہی کی ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ بعض وقت ہم کو اپنے پڑوس میں کئی کئی دہائی تک غیر مسلموں سے واسطہ پڑا ہے لیکن ان کو یہ تک نہیں معلوم ہوتا کہ اسلام میں غیر مسلم کے ساتھ کیا کردار بتایا گیا ہے اس کو یہ نہیں معلوم ہوتا کہ اسلام کا موٹا موٹا مطلب کیا ہے اس کے برعکس اس کو مسلمانوں سے خوف معلوم ہوتا ہے، اس نے صرف یہ سنا ہے کہ مسلمانوں کے اسلاف صرف مار دھاڑ کرتے رہے، اور اب ان کے یہ اخلاف بھی کچھ ایسے ہی خطرناک جذبات کے لوگ ہیں، پھر ان کو ان کے لیڈر اور بھی جھوٹی سچی باتیں بتا کر ان مسلمانوں سے بالکل مشکوک بنا کر نفرت سے دل بھر دیتے ہیں، ایسی صورت میں کیا ہماری یہ ذمہ داری نہیں ہے کہ ہم اپنے غیر مسلم پڑوسیوں کو اسلام کے متعلق اور مسلمانوں کے متعلق بتائیں؟ ان کی صحیح تصویر ان کے سامنے رکھیں اور ان کے ذہنوں میں اسلام کے بارے میں ایک اعلیٰ تصور پیدا کرنے کی کوشش کریں؟

اس ملک میں غیر مسلموں کا اسلام کے بارے میں تصور صحیح کرنے کی کوئی صورت نہیں رہی، اس کام کی طرف توجہ کم سے کم تر ہے۔ ہندوستان جیسے ملک میں جس میں متعدد المذاہب قومیں رہتی ہیں اور مسلمان اقلیت میں بھی ہیں، غیر مسلموں کی اسلام و مسلمانوں کے بارے میں جو غلط معلومات ہیں ان کو درست کرنے کی کوشش بہت ضروری ہے اور اسلام کا جو روشن چہرہ ہے اس کو دکھانے کی کوشش کرنا بہت بڑی ذمہ داری ہے یہ کام دعوت کا بھی ہے اور دعوت کا کام دیگر تمام طریقوں پر مقدم اور ان سے افضل ہے، اس کے بعد دوسرے طریقے آتے ہیں جن کو حسب موقع وحسبِ ضرورت اختیار کیا جاسکتا ہے۔

اس وقت صورت حال یہ ہے کہ ایک طرف تو مسلمانوں نے وہ تمام اخلاقی اور انسانی کمزوریاں اور برائیاں اختیار کرلی ہیں جو غیر مسلموں میں پائی

جاتی ہیں اور محض مردم شماری کے لحاظ سے مسلمان ہونے پر یہ توقع قائم کئے ہوئے ہیں کہ غیر مسلموں سے ان کے سب اختلافات معرکۂ حق و باطل ہیں اور مقابلہ پڑ گیا تو غزۂ بدر جیسی مدد ان کے لئے بھی آئے گی۔ اس وقت افسوسناک صورتِ حال یہ ہے کہ ہماری سیرت و کردار کمزور، ہماری سنجیدہ کوشش و جدوجہد ناقص، ہماری حکمت عملی غیر مدبرانہ، ہمارے جذبات بے قابو، ہمارا تعلق مع اللہ مشکوک اور غیروں میں ہمارا تصور خراب ہے، ایسی صورت میں صرف طاقتِ لسانی اور گرم لہجے اور گرم مظاہروں سے کہاں تک کام چل سکتا ہے؟ ہمارا کام سنجیدگی کے ساتھ موقع و محل کا لحاظ کرتے ہوئے حکمتِ عملی اختیار کرنے، اپنے کردار کو درست کرنے اور نرم گرم دونوں موقعوں کے لئے حضور سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ میں اجتماعی زندگی کے مختلف النوع حالات سے نمٹنے کی جو سنت رہی ہے اس کو اختیار کرنے سے ہی چلے گا، اس حقیقت کو ہمارے قائدین کو بھی سمجھنا ہے اور عام مسلمانوں کو بھی سمجھنا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم کو صحیح توفیق دے۔

باب چہارم

اتحاد اور اجتماعیت

- مسلمانوں کی ملی تعمیر کا مسئلہ
- وحدت اور مقصدیت ملت کی ناگزیر ضرورت
- تعاون اور رواداری اجتماعی کامیابی کا راستہ
- دو وحدتیں: وحدت خداوندی اور وحدت انسانی

مسلمانوں کی ملی تعمیر کا مسئلہ

انسانی زندگی کی درستگی اور حسن اس کے تربیتی نظام پر قائم ہے یہ تربیتی نظام ماں باپ پر قائم ہے یہ تربیتی نظام ماں باپ اور گھر کے بڑوں سے شروع ہو کر مصلحین اور سماجی قائدین اور متعلقین نظام تعلیم و تربیت تک جاتا ہے، اور خوش کن و پسندیدہ نتائج کے پیدا ہونے میں ان تینوں ذرائع کے اچھے ہونے کا بڑا حصہ ہے۔

زندہ قوموں میں اس اہم مسئلہ کی طرف بڑی توجہ دی جاتی ہے اور پھر اس کے بہتر سے بہتر مطلوبہ نتائج حاصل کئے جاتے ہیں، دوسری طرف اونگھتی سوتی اور لاابالی مزاج رکھنے والی قوموں میں اس کی طرف سے غفلت برتی جاتی ہے، پھر ان قوموں کو اس غفلت کے سنگین نتائج بھگتنے پڑتے ہیں۔

تاریخ میں اس کی دونوں طرح کی مثالیں خوب ملتی ہیں اور قوموں کے عروج و زوال کے اسباب میں اس بات کا بنیادی حصہ ہے، اسلامی زندگی اس کے تربیتی کام سے ہی مضبوط ہوئی اور ایک ایسی قوم جو منتشر بھی تھی مذہبی لحاظ سے

گمراہ اور دنیاوی لحاظ سے پسماندہ تھی، اس کی تربیت قرآن اور رسول اسلام کے ذریعہ ایسی ہوئی کہ نہ صرف وہ اپنے زمانہ کی قائد، معلم اور رہبر بنی، بلکہ مذہب، علم، ثقافت وتمدن سب کی اس نے ایک عظیم تاریخ بنادی، جس کے ورثہ وسرمایہ سے مسلمان قومیں صدیوں فائدہ اٹھاتی رہیں اور برابر فائدہ اٹھائی رہیں گی، موجودہ دنیا کی متمدن قوموں نے بھی اپنے علم وتمدن کی بنیاد اسی پر رکھی ہے، تربیت کے کام کو موجودہ زمانہ کو سامنے رکھتے ہوئے تین پہلوؤں پر تقسیم کیا جاسکتا ہے، ایک پہلو عمومی رہنمائی اور تربیت کا ہے جو گھر کے اندر گھر کے بڑوں کے ذریعہ اور گھر کے باہر قائدین ومصلحین اور عام مخلصین کے ذریعہ ہوتی ہے، دوسرا پہلو تعلیمی نظام کے ذریعہ عمل میں لانے کا ہے اور تیسرا پہلو دیگر اطلاعاتی و نشریاتی ذرائع سے تعلق رکھتا ہے، تربیت کے یہ تینوں پہلو نوخیز نسل کی تو باقاعدہ تشکیل کرتے ہیں، بڑی نسلوں کو جو تعلیمی نظام سے گذر چکی ہیں یا جن کو اس سے واسطہ نہیں پڑا ان کو بھی بقیہ ان میں سے دو پہلو بڑی حد تک متاثر کرتے ہیں اور ان کے مزاج وذہن پر اثر ڈالتے ہیں۔

ضرورت ہے کہ ہم مسئلہ کو باریکی کے ساتھ دیکھیں اور غور کریں کہ مسلمانوں کو اس رخ سے کیا نقصان پہنچ رہا ہے اور ان کی صحیح تشکیل میں کیا بگاڑ پیدا ہو رہا ہے۔

مسئلہ صرف نوخیز نسل کا ہی نہیں بلکہ اب بڑی نسل کا بھی ہے دونوں طرح کی نسلوں کو مذہب کا وفادار اور مسلمانوں کے تہذیبی ونظریاتی اقدار کا پابند کس طرح رکھا جائے؟ یہ ایک اہم مسئلہ ہے اگر اس کی فکر نہیں کی جاتی تو مسلمانوں کی تہذیبی مذہبی ونظریاتی زندگی کا بتدریج تحلیل ہوکر دیگر کسی قوم کے مذہبی، تہذیبی ونظریاتی سانچوں میں ڈھل جانا بالکل مستبعد نہیں۔

ہندو قوم کے متعلق بعض اہل تحقیق و مطالعہ نے لکھا ہے کہ مسلمانوں کے پورے دور اقتدار میں ان کے گھروں کے اندر عورتیں بچوں کے لیے ہندی اور اپنی مذہبی بنیادی تعلیم و تربیت کا نظم رکھتی رہیں اور ہندو تاجر اپنے تجارتی بہی کھاتے ہندی میں رکھتے رہے اس کی بنا پر مسلمانوں کا اقتدار ختم ہوتے ہی ہندو تہذیب و مذہب اپنی پوری زندگی کے ساتھ ابھر کر آ گیا، ہندو تہذیب کی حفاظت میں ان کی عورتوں نے بڑا نمایاں حصہ لیا اور گھروں کے اندر اس کو برابر قائم رکھا جس کی وجہ سے ان کی نئی نسلیں ثقافتی تحلیل سے محفوظ رہیں۔

مسلمانوں کے گھروں میں تقسیم ہند کے قریب تک اسلام سے وابستہ رکھنے کے لیے اس طرح کے ایک انتظام کی مثال ملتی ہے اور وہ مثال یہ ہے کہ بچوں بچیوں کو ان میں سمجھ آتے ہی قرآن مجید ناظرہ پڑھانا اور عربی و اردو کی حرف شناسی کرانا شروع کرا دیا جاتا تھا، اور بچہ جب اسکول و مدرسہ جانے کے قابل ہوتا تو وہ قرآن مجید ناظرہ کے مرحلہ سے گذر چکا ہوتا تھا، اس کے ساتھ ساتھ بچوں کی مائیں اور بڑی بوڑھیاں بچوں کے والد اور بڑے ان کو اسلام کے بنیادی معاملات سے باتوں باتوں میں واقف کرا دیتے تھے، انبیاء علیہم السلام اور نبی آخر الزماں حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک امتی ہونے کا ربط و تعلق پیدا کر دیتے تھے اور ان کے دلوں میں یہ فخر پیدا کر دیتے تھے کہ وہ مسلمان ہیں اور مسلمان ہی معیاری انسان ہوتا ہے۔

لیکن یہ رواج تقسیم ملک کے بعد ہی سے کم ہوتا چلا گیا اور اب اس کی جگہ ریڈیو و ٹیلی ویژن کے پروگراموں نے اور کھیل کے ماہرین کے ناموں اور کارناموں نے لے لی ہے، آج ایک مسلمان بچہ سے انبیاء کے سلسلہ میں کچھ پوچھا جائے تو ان سے ناواقف نکلے گا، لیکن کرکٹ کے کھلاڑیوں کے پورے

حالات جانتا ہوگا، لکھی ہوئی چیزوں کو سامنے رکھدیا جائے تو قرآن مجید عربی اور اردو الفاظ کے پڑھنے سے قاصر ہوگا اس کے بجائے وہ ہندی یا انگریزی کا حرف شناس پایا جائے گا۔

اب والدین کو اس کی فرصت نہیں کہ وہ اپنے بچوں کے دماغ میں کوئی ایسی بات ڈال سکیں جو ان کو ان کے مذہب و تہذیبی اقدار سے روشناس کرا سکے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ بچے جو اپنے گھروں سے اپنے مذہب اور اپنے تہذیبی اقدار سے بیگانہ نکلتے ہیں، قومی نظام تعلیم کے دھارے میں پڑنے کے بعد کسی بھی تہذیبی و مذہبی رخ کو اختیار کر سکتے ہیں۔

گھر کے دائرہ سے آگے بڑھ کر باقاعدہ تعلیم کا مرحلہ آتا ہے اس پر نظر ڈالی جائے تو اس کے سلسلہ میں بھی فضا بالکل تاریک نظر آتی ہے، کسی قوم کے اس کے اپنے اقدار پر قائم رکھنے کے لیے اس کے تعلیمی نظام میں سب سے اہم مسئلہ زبان کا اور ذہنی تشکیل کا فرض انجام دینے والے مضامین کا ہوتا ہے، انہیں سے فرد کی شخصیت بنتی ہے اور اس کے اخلاق کسی متعین سانچے میں ڈھلتے ہیں اور یہ مسئلہ کوئی جزوی یا محدود مسئلہ نہیں ہے، بلکہ بہت ہمہ گیر اور نتیجہ خیز مسئلہ ہے اس سے نہ کوئی اپنی مذہبی سوسائٹی اپنے کو مستغنی سمجھ سکتی ہے اور نہ کوئی نامذہبی سوسائٹی، اس سے قوم کے افراد میں ذمہ داریوں کا احساس پیدا ہوتا ہے اور اپنے مقاصد پر ایمان اور ان کے لیے جدوجہد کرنے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے، یہ کوئی معمولی مسئلہ نہیں ہے، یہ بے حد اہم اور بنیادی مسئلہ ہے، اقوام وملل کے لیے اس کی حیثیت موت وزیست کے سبب کی ہوتی ہے۔

جہاں تک زبان کے مسئلہ کا تعلق ہے تو اس کی اہمیت صرف یہی نہیں ہے کہ وہ اس کے بولنے اور استعمال کرنے والوں کے درمیان ایک مانوس اور

پسندیدہ ذریعہ رابطہ ہے، بلکہ اس کی اہمیت اس کے استعمال کرنے والوں کے ذہنوں اور رجحانات پر اس کے اثر میں بھی خاصی ہے۔

زبان کے الفاظ و جملے، محاورے تلمیحات اور فقرے اپنی اپنی مخصوص شخصیت رکھتے ہیں اور ان کا سننا چھوٹے پیمانے پر تقریباً وہی اثر رکھتا ہے جو مختلف لوگوں سے ملنے سے ہوتا ہے جس طرح انسانوں میں مختلف الخیال اور مختلف الاثر افراد ہوتے ہیں کہ کسی سے ملنے پر نیک خصلت انسان کا پرتو ملتا ہے اور کسی سے ملنے پر بدنیت انسان کا سایہ محسوس ہوتا ہے اور کسی سے ملنے پر ایک مسلمان کی ملاقات کا لطف ملتا ہے اور کسی ملاقات پر کافر کی پرچھائیں نظر آتی ہے یہی بات زبان کے الفاظ اور فقروں میں بھی ملتی ہے، عبادت اور پوجا اور پریر (PRAYER) سلام اور پرنام، اللہ، پرمیشور اور گاڈ (Goad) کے الفاظ اپنے الگ الگ تاثرات دیتے ہیں، اگرچہ معنی کے اعتبار سے ایک دوسرے کے مرادف سمجھے جاتے ہیں، عبادت کے لفظ سے کوئی شخص نماز کی ہیئت میں یا اسلامی طریقہ پر ذکر کرتے ہوئے تصور میں آتا ہے اور پوجا کے لفظ سے مندر اور بت کا تصور ابھرتا ہے، سلام کے لفظ سے السلام علیکم کہتا ہوا کوئی مسلمان آنکھوں میں پھر جاتا ہے اور پرنام کے نام سے کوئی شخص ہاتھ جوڑ کر آداب بجالاتا ہوا معلوم ہوتا ہے، جس کے متعلق ذہن میں غیر مسلم کا خیال ابھرتا ہے، زبان یوں تو کہنے کو محض زبان ہے، لیکن وہ دراصل پوری تہذیب ہے، وہ نظام اخلاق ہے، وہ مذہب ہے، صرف زبان کی تعلیم سے کسی کے بھی ذہن کو ایک مذہب سے دوسرے مذہب کی طرف، ایک تہذیب سے دوسری تہذیب کی طرف منتقل کیا جاسکتا ہے۔

ہندوستانی مسلمان اردو سے دست بردار ہوتے ہوئے افسوس ہے کہ یہ نہیں سوچتے کہ وہ اپنی نسلوں کو کہاں سے کہاں منتقل کرنے جارہے ہیں۔

زبان کے اثرات عام زندگی میں بھی پڑتے ہیں اور نظام تعلیم پر بھی پڑتے ہیں، نظام تعلیم میں زبان کی تعلیم اپنے الگ قسم کے اثرات اور فوائد رکھتی ہے، اسی لئے تمام زندہ قومیں زبان کی تعلیم اور زبان کے مسئلہ میں اصرار اپنی قومی وملی زندگی کے لئے ضروری مسئلہ سمجھتی ہیں اور اس پر مفاہمت کے لئے تیار نہیں ہوتیں، ہاں اگر کسی ناگزیر حالات کے باعث زبان کی تبدیلی ہوجائے تو سب سے مقدم ضرورت یہ ہوتی ہے کہ اس نئی زبان کے اپنی تہذیب میں سما جانے سے اپنی زبان پر جو غلط اثرات پڑ سکتے ہیں ان کے تدارک وازالہ کے لئے خارجی یا اضافی تدابیر اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔

جہاں تک ان مضامین کا تعلق ہے جو ذہنی تشکیل کا فرض انجام دیتے ہیں ان میں ادب، تاریخ، سیاست اخلاق اور دیگر سماجی مضامین خاص طور پر قابل ذکر ہیں، ان مضامین کے ذریعہ ہر طرح کا اثر قارئین کے ذہنوں اور دلوں پر ڈالا جاسکتا ہے، موافق اور متضاد تصورات پیدا کئے جاسکتے ہیں، ان کے ذریعہ انسانی ذہنوں میں تبدیلی لانے کا کام پوری کامیابی سے کیا جاسکتا ہے، یہ وہ مضامین ہیں کہ کوئی پڑھا لکھا آدمی ان سے صرف نظر نہیں کرتا، اگر تعلیم گاہ کے مرحلہ میں یہی نہ ملیں تو عام علمی زندگی میں ان سے رابطہ قائم کرایا جاتا ہے اور پھر ان مضامین کا مواد فراہم کرنے والے اپنے قارئین کے ذہنوں کو اپنے شیشے میں اتار لیتے ہیں۔

تاریخ میں اورنگ زیب کو جس طرح بدنام کیا گیا اور مسلمان حکمرانوں کی جو خراب تصویر پیش کی گئی، اس سے عام پڑھے لکھے مسلمان کتنی بڑی تعداد میں متاثر ہوئے اور ان کو اپنے اسلاف کے اس طبقہ سے نفرت کا احساس ہونے لگا، اس میں قصور کس کا تھا، قصور دراصل خود مسلمانوں کا تھا کہ انہوں نے غیر

مسلموں کی لکھی ہوئی تاریخ کو اپنی معلومات کا ذریعہ بنایا اور نئی نسل کے لئے اسی کو عملی سرمایا بنایا، لیکن جب بعض مسلمان ماہرین تاریخ نے ان غلط فہمیوں کا پردہ چاک کیا تو بہت سے لوگوں کے ذہن درست ہوئے، لیکن پھر بھی کتنے ایسے ذہن ہیں جو ابھی اس نئے وضاحتی لٹریچر تک نہیں پہنچ سکے، اور جادوناتھ سرکار کی لکھی تحریروں کو آخری اور مستند ترین ماخذ سمجھتے ہیں۔

علم الاخلاق ایک وسیع علم بن چکا ہے، جس میں یورپ کے بڑے بڑے مفکرین نے اپنی محنت و تحقیق سے رنگ آمیزی کی ہے اور پڑھے لکھے لوگ عموماً اسی سے متاثر ہیں ان کے تأثر کو صرف ان کو برا کہنے سے دور نہیں کیا جاسکتا، وہ علمی و تجرباتی بنیادوں کا سہارا لیتے ہیں، اور ان سے اپنی بات کو وقیع بناتے ہیں۔ ان کے توڑ کے لئے ہم اگر اسی معیار کا جواب نہیں تیار کرتے تو ہم ان کے بنائے ہوئے تصورات اور خیالات کو بدل نہیں سکتے، اس وقت مسلمانوں کا علمی قافلہ عموماً ان ہی تصورات اور خیالات کے جلو میں چل رہا ہے۔

جدید یورپ نے فلسفہ اور نفسیات کے دائروں میں بہت سے نظریات اپنائے ہیں جن کی بنیاد الحاد و مادہ پرستی پر اور کسی حد تک بگڑی ہوئی عیسائیت پر ہے، لیکن ان نظریات پر علمی تحقیق اور تجرباتی نتائج کا غلاف چڑھا کر ان کو مؤثر اور خوشنما بنا دیا ہے سارے مشرقی ممالک کی درس گاہوں میں بھی آج اس کی ترویج اور چلن ہے اور جدید تعلیم یافتہ انسان ان کا خاصا حد تک شکار ہے، کیوں کہ اس کے پاس مناسب اور مطمئن کرنے والی زبان و طریقۂ استدلال میں ضرورت کی کتابیں نہیں ہیں جن کو وہ جدید یورپ سے آئے ہوئے علمی سرمایہ کا بدل سمجھ سکے۔

افسوس یہ ہے کہ ہمارے دینی مدارس و جامعات بھی اس ضرورت کی

طرف توجہ نہیں دے رہے ہیں اور اپنے یہاں کے خوشہ چینوں کو ایسا سرمایا نہیں دے رہے ہیں جو ان کو اپنے فکری معتقدات اور اپنے تہذیبی معمولات کو صحیح طور پر سمجھنے اور مخالف خیالات کے بطلان کو جاننے کا ذریعہ بن سکے، اور ''جان جاک روسو'' نے جس جمہوریت کا ذہن بنایا، ''ڈارون'' نے انسان کی جو حقیقت بتائی، ''فرائڈ'' نے انسانی جذبات کی جو بنیاد متعین کی، ''جان بول سارٹر'' نے انسان کا جو مقام وضرورت طے کی، ''میکاولی'' نے سیاست وطاقت کا جو فلسفہ مقرر کیا، ''مارکس'' نے انسانی سماج کا جو نظام بنایا وہ سب محض سرسری دعووں پر نہیں متعین کیا، بلکہ ان کے ساتھ زبردست علمی استدلالات کا انبار لگایا، اگر ہم علم کو علم سے زیر نہیں کرتے تو ہم مغلوب ہونے پر مجبور ہوں گے کیوں کہ لوہے کو لوہا ہی کاٹتا ہے۔ ہندوستان میں ان فلسفوں میں ایک اضافہ مقامی غیر اسلامی فلسفہ کا ہو رہا ہے جو ان پر مستزاد ہے عصر جدید کی تعلیم گاہیں اور علمی ادارے انہی سب فلسفوں اور نظاموں کے سایہ میں چل رہے ہیں اور ان سے مسلمانوں کی جدید نسلیں بھی وابستہ ہیں۔ ان کے صرف چند افراد کو ہماری خالص دینی درس گاہیں اور ادارے کسی طرح حاصل کر لیتے ہیں اور ان کو اسلامی رنگ میں رنگنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن ایک تو ان کی تعداد دیگر افراد کی تعداد کے لحاظ سے دو چار فیصدی سے زیادہ نہیں، مزید یہ کہ ان کے لئے طے کردہ نظام تعلیم میں سماجی مضامین کا علی العموم کوئی حصہ نہیں، اس کی ناگزیر ضرورت کے لئے ہماری ان درس گاہوں کے طلباء عصر جدید کے عمومی دھارے میں بہنے پر مجبور ہوتے ہیں یعنی ان کو اس کے سلسلہ میں وہی لٹریچر مطالعہ کے لئے ملتا ہے جو غیر اسلامی ذہن اور غیر اسلامی خیالات کی اساس پر تیار کیا گیا ہے اور برابر کیا جا رہا ہے، ہمارے تربیتی نظام میں عام ماحول اور تعلیم گاہوں کے پہلوؤں کا تو یہ حال ہے جو ہماری نئی نسل کو کسی

دوسرے رخ پر بہانے کے لئے کافی ہے اس پر مستزاد تربیتی نظام کا تیسرا پہلو ہے جو اطلاعاتی ونشریاتی ذرائع سے تعلق رکھتا ہے، ریڈیو اور ٹیلیویژن اور روزنامے یہ روزینہ تربیت کا منظم نظام بنے ہوئے ہیں اور تصورات و معتقدات کو نئے سانچوں میں ڈھالنے کا کام کر رہے ہیں۔ شرک وکفر، فسق وفجور، قتل ودہشت گردی سے جس طرح ذہنوں کو مانوس بنایا جارہا ہے اور مادہ پرستانہ ذہن کو جس طرح ابھارا جارہا ہے وہ اگر تعلیم اور عمومی ماحول کے ذریعہ بگاڑ پیدا ہونے میں کوئی کمی رہ گئی ہو تو یہ اس کی کمی کو بدرجہ اتم پورا کرنے کا فرض انجام دے رہا ہے۔

اس تمام صورت حال کے مقابلہ کے لئے ہمارے پاس کیا طریقہ و ذریعہ ہے؟ اولاً تو مسلمانوں کے اہل علم وفکر طبقہ کو صورت حال کا صحیح جائزہ لینا چاہئے اور پھر اس کے لئے عملاً جو تدابیر اختیار کرنا ضروری ہیں وہ حسب مقدور اختیار کرنی چاہئیں، اس وقت ہماری ملت کی بڑی مصیبت ہے کہ زبانی کام بہت بڑھا ہوا ہے، تقریروں اور تحریروں کے ذریعہ ملت کی جو خدمت انجام دی جارہی ہے، عموماً اسی پر اکتفا کیا جارہا ہے حالانکہ بنیادی ضرورت ٹھوس اور عملی کام کی زیادہ ہے۔

میرے نزدیک اس وقت پانچ نقاط پر زیادہ توجہ دینے کی ضرورت ہے:

(۱) ایک تو مسلمان گھروں میں حسب مقدار ایسا ماحول بنانا چاہئے کہ اس سے نئی نسل کے افراد اپنے مذہب، اپنی ثقافت کا اولین درس ضرور حاصل کرلیں اس کے لئے گھروں کے اندر اختیار کیا جانے والا پرانا طریقہ دوبارہ رائج کرنا چاہئے کہ والدین اور گھر کے بڑے اس کی فکر کریں کہ بچے بچیاں سمجھ کی عمر تک پہنچتے ہی قرآن مجید اور دین کی بنیادی باتیں جان لیں خواہ ماں باپ خود یہ کام کریں یا گھر کے دیگر بڑی بوڑھیاں انجام دیں، گھر کے اندر اسی ابتدائی عمر میں بچوں بچیوں کو

اپنے مذہب اپنے رسول اور اپنے بزرگوں اور موٹے موٹے تہذیبی معاملات بتادیئے جائیں اور ان میں اپنے مذہب سے تعلق و محبت کا جذبہ پیدا کردینا چاہیئے، یہ کام کچھ مشکل نہیں ہے، کیونکہ ابھی مسلمانوں کی وہ نسل باقی ہے جس نے اسی طریقہ سے اپنے دین اور اس کے بنیادی معاملات کو اپنے بڑوں سے سیکھا اور جانا ہے، رات میں ماں باپ اپنے بچوں کو جو کہانیاں سناتے ہیں ان کے اپنانے میں بھی اس مقصد کو پیش نظر رکھا جاسکتا ہے اور ان سے بھی بڑا کام لیا جاسکتا ہے اس کے علاوہ ریڈیو ٹیلی ویژن اور اخبارات و رسائل سے استفادہ کے سلسلہ میں اعتدال اور کنٹرول قائم کرنا چاہیئے، تاکہ کم از کم ان کے مضر اور وقت کو ضائع کرنے والے پروگرام بچوں بچیوں اور گھر والوں کو کم سے کم نقصان پہنچائیں، اسی کے ساتھ ساتھ وقتاً فوقتاً ایسے امور کی طرف توجہ دلانی چاہیئے جن سے اخلاق و سیرت کے بننے میں مدد مل سکتی ہو، یہ سب کام آسانی سے اٹھتے بیٹھتے چلتے پھرتے ہوسکتا ہے اس کے لیے صرف فکر و احساس کی ضرورت ہے کسی بڑے انتظام کی ضرورت نہیں

(۲) دوسرا نقطہ یہ ہے کہ تعلیمی نظام کے حکومتی انتظام میں ہونے کی وجہ سے تمام اسکول اور تعلیم گاہیں ایسی تعلیم سے خالی ہیں جن سے اسلامی مذہب و ثقافت کو مدد مل سکتی ہے اور مسلمانوں کی نئی نسل کے طلبہ کا تقریباً ۹۵٪ فیصد حصہ ان ہی میں پڑھنے جاتا ہے، ان تعلیم گاہوں کو تو ہم قابو میں نہیں لاسکتے لیکن یہ ضرور کرسکتے ہیں کہ اقلیتی تعلیم گاہیں قائم کرنے کی جہاں تک گنجائش ہو اس کو اختیار کریں نیز ایسے ضمنی مکاتب بکثرت قائم کرسکتے ہیں جو حکومتی درسگاہوں کے پہلو بہ پہلو ضمنی طور پر ان مضامین کی تعلیم مہیا کرسکتے ہیں جن کی ضرورت ہمارے طلبہ کو ناگزیر ہے۔

(۳) تیسرا نقطہ یہ ہے کہ ہم اپنے معاشروں کے مزاج ورنگ کو حتی الوسع اسلامی رکھنے کی کوشش کریں، جہاں ہماری آبادیاں ہیں مسجدیں ہیں وہاں ہم اخلاقی سطح پر روک ٹوک اور توجہ دہانی کے ذریعہ ماحول کو خراب ہونے سے بچانے کی کوشش کریں، وقتاً فوقتاً ایسے مواقع لانے کی کوشش کریں جن سے اہالیان محلّہ کو اسلام کی اساسیت ومہمات سے واقفیت ہوتی رہے یا وہ تازہ ہوتے رہیں۔

(۴) چوتھا نقطہ یہ ہے کہ ہمارے دینی واسلامی مدارس اپنے نصاب کی ترتیب میں اس کا خیال رکھیں کہ مسلمانوں کو اپنی زندگی میں جن امور سے سابقہ پڑتا یا پڑسکتا ہے ان کے بارے میں ضروری اور بہتر سے بہتر معلومات حاصل ہوں اور ان کی ایسی رہنمائی ہو کہ وہ ان کے بارے میں اپنی ضرورت کے لحاظ سے بہتر سے بہتر معلومات اور نقطہ نظر بنا سکیں اور رکھ سکیں اس میں خاص طور پر تاریخ عالم اسلام کے سلسلہ کی معلومات سیاسی معلومات، علم الاخلاق، علم النفس، اور فلسفہ کے صحیح اسلامی نظریات اور علم وتعلیم کے سلسلہ میں صحیح اسلامی نقطۂ نظر اور مختلف سماجی عمرانی مضامین جن سے موجودہ زندگی کو سابقہ پڑتا رہتا ہے، قابل ذکر ہیں۔ اس لیے کہ اگر ہماری دینی واسلامی تعلیم گاہوں میں ان کی طرف توجہ نہ کی گئی تو یہ مضامین ومعلومات طلبہ دوسرے اور غیروں کے علمی سرچشموں سے حاصل کریں گے، وہ ان سے صرف نظر نہ کرسکیں گے، اور غیروں سے حاصل کرنے کی صورت میں ان سے نقصانات واضح ہیں۔

(۵) پانچواں نقطہ یہ ہے کہ صحافت اور لٹریچر کی طرف بھی توجہ کی جائے، کیونکہ ہم رائج الوقت صحافت ولٹریچر کو روک نہیں سکتے جس سے زبردست اثرات ذہنوں اور خیالات پر پڑ رہے ہیں، لہٰذا ان کا متبادل مہیا کرنا اور قارئین کی اس طلب کو پورا کرنا ہی اس کا صحیح حل ہے۔

وحدت اور مقصدیت

ملت کی ناگزیر ضرورت

اس وقت ملت اسلامیہ کے مقاصد کے نام سے جگہ جگہ کوششیں ہو رہی ہیں، جد و جہد اور تحریکیں بھی چل رہی ہیں قربانیاں بھی دی جا رہی ہیں اور اس سلسلہ میں نوجوان عنصر سے بھی بڑی طاقت مل رہی ہے بلکہ اکثر ملی اور قومی تحریکوں اور کوششوں میں وہ پیش پیش ہیں اور قربانیاں دے رہے ہیں اور مخالف طاقتوں سے لوہا منوا رہے ہیں، نوجوان عنصر ہر ملت اور قوم کے لئے بڑی طاقت اور بڑا سہارا ہوتا ہے اور اس کے جذبہ و جوش سے مقصد کے حصول میں بڑی مدد ملتی ہے۔ یہ حقیقت جس طرح ماضی میں جانی گئی تھی اس سے کہیں زیادہ حال میں جانی جا رہی ہے، اسی لئے ہر جگہ اس طاقت کو اپنانے اور اس سے کام لینے کی کوشش کی جاتی ہے۔ نوجوانوں کو متوجہ کرنے، ان کو قریب کرنے اور ان کو متحرک بنانے کے طریقے اختیار کئے جاتے ہیں اور ان سے فائدہ اٹھایا جاتا ہے، لیکن یہ

جائزہ لینے کی بات ہے کہ نوجوانوں کے جذبات کو یہ متحرک کرنے والے کہاں تک بامقصد ہیں، نوجوانوں سے کمیونسٹ تحریک بھی کام لیتی ہے، نوجوانوں سے انقلاب پسند طاقتیں بھی مدد لیتی ہیں، نوجوانوں سے باغیانہ عناصر بھی مدد لینے کی کوشش کرتے ہیں اور نوجوانوں سے نیک و اعلیٰ مقاصد رکھنے والے بھی کام لیتے ہیں اور ہر ایک کچھ نہ کچھ فائدہ اٹھا لیتا ہے۔ اس سلسلہ میں مسرور کن مثالیں بھی ہیں، دراصل نوجوان عنصر ایک طاقت ہے، ایک دھارا ہے، صحیح رخ پر لگے تو راستہ کی چٹان کو پاش پاش کر دے اور مقصد کی راہ میں حائل ہونے والی رکاوٹوں کو بہا لے جائے اور اگر غلط رخ پر لگے تو دشمن کو روکنے والی فصیلوں کو توڑ دے اور عظیم قدروں کی بنیادوں کو بھی ہلا دے۔

نوجوانوں کی اس طاقت و صلاحیت کی پوری قدر کی ضرورت ہے اور اس سے کام لینے میں اجتماعی و قومی مصلحت کا خیال رکھنے اور تعمیری جذبہ سے کام لینے کی ضرورت ہے اور یہ کام ملت کی قیادت کا ہے کہ وہ غور کر کے فیصلہ کرے کہ اس کو نوجوانوں کو کس طرف چلانا ہے اور ان کی طاقت سے کیا کام لینا ہے۔

امت اسلامیہ صدیوں سے پسماندگی، انتشار اور بے بضاعتی کی زندگی گزارتے گزارتے پست ہمت ہو چکی ہے۔ اس میں سنجیدگی اور قوت عمل کی خاص کمی پیدا ہو گئی، اپنی شاندار تاریخ کے مطالعہ سے تمناؤں اور توقعات کے اس کے سامنے باغات لگ جاتے ہیں، لیکن یہ باغات ماضی کے ہیں حال کے لئے ہم کو خود باغ لگانا ہے، ماضی پر تکیہ کر کے بیٹھ رہنا سراب سے امید لگانا ہے، دیگر قوموں کی طرح ہماری ملت کو بھی یقیناً نوجوانوں کی طاقت کی بڑی ضرورت ہے اور شاید اس آخر الذکر کی ضرورت اول الذکر سے کہیں زیادہ ہے، کیونکہ یہ کام قیادت کا ہے کہ ملت کی طاقتوں کو صحیح رخ پر لگائے اور غلط رخ پر اس کے لگنے کے

برے نتائج سے امت کو بچائے۔

موجودہ ملت اسلامیہ کی قیادت اسی ملت سے ابھری ہے، چنانچہ اس کو بے عملی اور بے خیالی اسی ملت سے ورثہ میں ملی ہے، یہ قیادت جو کہ بے شمار حصوں اور قسموں میں بٹی ہوئی ہے، علی العموم اپنا معیار و مقصد مقرر نہیں کر سکی ہے، اس کے یہ حصے کچھ تو باہم دست و بگریباں ہیں، کچھ بے مقصد جد و جہد میں مبتلا ہیں اور کچھ محض جذبات میں سرشار ہیں، اور جو جذبات پسند عناصر ان کو ہاتھ آ گئے ہیں ان کی طاقتوں کو غیر حقیقی کوششوں میں ضائع کر دیتے ہیں۔

مسلمانوں کی قیادت کی تاریخ میں متعدد ایسی مثالیں ملتی ہیں کہ ان کی قیادت نے وقت کی صحیح ضرورت کو سمجھا اور اخلاص کے ساتھ اس پر محنت کی تو اس کے نتیجے میں ناقابل تصور نتائج حاصل کئے۔ سلطان صلاح الدین ایوبی متعدد مسلم سلطنتوں میں سے صرف ایک محدود سلطنت کے مالک تھے لیکن انھوں نے اپنی قیادت کو اخلاص کے ساتھ صحیح رخ پر لگایا تو وقت کا سب سے بڑا کارنامہ انجام دیا اور وہ تھا فتح بیت المقدس کا کارنامہ جس کو آج تک سنہرے حرفوں سے لکھا جاتا ہے اور تا قیامت لکھا جاتا رہے گا۔

لیکن ہمارے موجودہ عہد کا ایک بڑا فتنہ ملت اسلامیہ کا انتشار اور بے مقصدیت ہے، دوسرا ایک فتنہ ہر کس و ناکس کا شوق قیادت ہے۔ ہماری ملت اسلامیہ میں یہ شوق مرض کی حیثیت اختیار کر گیا ہے، اس شوق نے ایک پیشہ کی شکل بھی اختیار کر لی ہے۔ قیادت کے یہ خواہش مند خواہ قیادت کی معمولی صفات و خصوصیات سے بھی عاری ہوں لیکن اس کام کو پورے شوق و جوش سے اپناتے ہیں۔ اس کی وجہ سے امت قیادتوں میں الجھ کر رہ گئی ہے اور اس میدان شوق میں ہمارے نوجوان بھی اپنے ذوق کے بقدر حصہ لیتے رہتے ہیں، جو میدان زندگی میں

نئے نئے داخل ہوئے ہوتے ہیں اور ان کے پاس تجربات کے مقابلے میں جوش کا سرمایہ زیادہ ہوتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہوش کے موقعوں پر بھی جوش سے مسئلہ حل کرنے کا رویہ اختیار کرتے ہیں۔ یہ بات خطرہ کی خاصی علامت بن گئی ہے۔

اس وقت ملت اسلامیہ کی سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ خودنمائی بے مقصد اظہار اور خالی خولی آرائش سے پرہیز کریں، اس زمانے کے اہم ترین فتنوں کو سمجھنے کی کوشش کریں اور ان کے تدارک کے لئے پورے ہوش و اخلاص سے حل تلاش کیا جائے، امت کو وحدت اور مقصدیت کی بھی بڑی ضرورت ہے، تاکہ ہم مضبوط ہوں اور کسی بھی دشمن کے مقابلہ کے لئے امت اس طرح سامنے آئے جس طرح قرآن مجید کی اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ "کأنهم بنيان مرصوص" کہ گویا سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہیں۔

تعاون اور رواداری

اجتماعی کامیابی کا راستہ

مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کی ایک بڑی ضرورت یہ ہے کہ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کے لئے اپنے دل میں وسعت اور اس کے معاملہ میں رروا داری اور لحاظ کا رویہ اختیار کرے، اس سے محبت کے ساتھ پیش آئے، اس کا جو اجتماعی اور اخلاقی حق ہے اس کو پورا کرے، اس سے رائے کا اتفاق ہو تو ظاہر ہے کہ دونوں میں توافق و یکجہتی خود بخود پیدا ہوگی، لیکن اگر رائے کا اختلاف ہے تو پھر اس کی ضرورت ہے کہ رواداری برداشت اور لحاظ کا معاملہ اختیار کیا جائے اور یہی وہ موقع ہوتا ہے جہاں ایک مسلمان کا دوسرے مسلمان کے حق اخوت کی ادائیگی کا امتحان ہوتا ہے۔ مسلمان کو اس سلسلہ کی ہدایت اور رہنمائی اس کے مذہب اور علم الاخلاق دونوں کی طرف سے ملی ہے، اور دیگر قوموں کے افراد نے صرف علم و مطالعہ سے

ان اخلاقیات کی ضرورت محسوس کی ہے، لیکن مسلمان اس کے باوجود اس سلسلہ میں کمزور اور کوتاہ ہیں، اور ترقی یافتہ قومیں اپنی اجتماعی زندگی کی ان اخلاقیات پر خاصی حد تک عامل ہیں، یہی وجہ ہے کہ ہم کو ان ترقی یافتہ قوموں کی اجتماعی زندگی میں نظم وتوافق کی نمایاں مثالیں ملتی ہیں، اور ان کی اس خصوصیت کی بنا پر ان قوموں میں اجتماعی یک جہتی اور نظم وضبط کا بڑا اظہار ہوتا ہے اور یہ ان کی طاقت دنیاوی کامیابی کا بڑا راز ہے۔

اس کے برعکس مشرق کی ترقی پذیر قوموں میں اور خاص طور پر مسلمان ملکوں اور ان کے معاشروں میں ایسی پراگندگی، انتشار واختلاف نظر آتا ہے کہ دیکھنے والا یہ محسوس کرسکتا ہے کہ یہ سب ایک دوسرے کے مخالف اور دشمن ہیں، اور صرف کسی دباؤ ومجبوری کی بنا پر اکٹھا رہتے ہیں، لیکن ان کے دل ودماغ ایک دوسرے سے علاحدہ ہیں، کیونکہ جہاں چار آدمی اکٹھا ہوئے اور انھوں نے کسی کام کے سلسلہ میں تعاون کا منصوبہ بنایا تو تھوڑی ہی مدت میں ان میں اختلاف شروع ہوجاتا ہے، جو بعض وقت کھلے تصادم تک پہنچ جاتا ہے، اور پھر کم از کم ایک دوسرے سے علیحدگی پر ختم ہوتا ہے، یہ وہ مرض ہے جس نے مسلمان معاشروں کو بالکل کھوکھلا کردیا ہے، اس کی ایک وجہ تو خودرائی اور خودپسندی ہے جو ایک عام مرض کی طرح مشرقی معاشروں اور مسلمانوں میں پھیل چکی ہے، دوسرے اپنے ذاتی فائدوں کو اجتماعی اور قومی فائدے پر ترجیح دینے کی کمزوری ہے، جو ایک طرح سے عام مزاج بنتی جارہی ہے، ہر شخص اپنی رائے کو صرف صحیح ہی نہیں سمجھتا بلکہ آخری حد تک صحیح سمجھتا ہے، پھر اس سے مختلف رائے خواہ قریبی دوست کی طرف سے یا اس کے ہمسر اور ساتھی کی طرف سے ہی کیوں نہ ہو لائق توجہ نہیں سمجھتا، اسی طرح اگر کسی معاملہ میں کوئی ذاتی مفاد ہو تو اس کے حصول کی خاطر اجتماعی اصول، اخلاقی تقاضا، اور قومی مصلحت سب کو نظر انداز کردیتا ہے، یہ بات

زندگی کے اکثر معاملات میں ہوتی ہے، خواہ وہ عام دنیاوی معاملات ہوں یا اخلاقی دینی اور عام انسانی معاملات ہوں، خواہ اس کی وجہ سے اجتماعیت کا شیرازہ بکھرتا ہو، اور دو دوستوں، دو ہم مذہب بھائیوں، دو متفق المقصد ساتھیوں کے درمیان جدائی پیدا ہوتی ہو، چنانچہ مسلمانوں کی اجتماعی وحدتیں قائم ہونے کے تھوڑے ہی عرصہ بعد انتشار اور شکستگی کا شکار ہونے لگتی ہیں، اور ایک اتحاد کئی اتحادوں میں، ایک ادارہ کئی ٹکڑوں میں بٹ جاتا ہے، اور پھر اس کے ٹکڑوں کے ٹکڑے ہونے لگتے ہیں۔

مسلمانوں کا یہ اجتماعی مرض صرف ان کے غیر تعلیم یافتہ طبقوں ہی میں نہیں بلکہ تعلیم یافتہ طبقوں میں بھی یکساں طریقے سے پایا جاتا ہے، اور باوجود شعور کی بیداری کے اس میں کمی نہیں ہو رہی ہے، یہ مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کے لئے ایک بڑا خطرہ ہے، جس کو مسلمان من حیث الافراد اور ان کی قیادتوں دونوں کو توجہ دینا چاہئے اور ملت کو اس کے نتائج بد سے بچانا چاہئے۔

خاص طور پر ملت اسلامیہ کی وہ اکائیاں جو سیاسی اور بین الاقوامی لحاظ سے کمزور حالت میں ہیں ان کو تو اس کی طرف بہت توجہ دینا چاہئے۔ ان کی جو صلاحیتیں آج آپس میں دست وگریباں رہنے میں صرف ہو رہی ہیں ان صلاحیتوں سے وہ ملت کے افراد اور جماعت دونوں کو غیر معمولی فائدہ پہنچا سکتے ہیں، لیکن افسوس ہے کہ وہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر جو عموماً افراد کی خودرائی اور ان کی ذاتی مصلحتوں کی طلب کے نتیجہ میں ابھر کر سامنے آجاتی ہیں، اپنی صلاحیتوں کو ضائع کر دیتے ہیں اور ان نقصانات کو قبول کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں جو ملت کو نیچے کر دیتے ہیں اور افراد کی متوقع ترقی کو بھی روک دیتے ہیں۔

اگر مسلمان اپنی اجتماعی زندگی میں برداشت کے اصول کو اپنا لیں تو مذکورہ بالا خرابی کی بہت کچھ روک تھام ہو سکتی ہے، ایک مسلمان دوسرے مسلمان کو

اپنا ہمسر اور برابر کا صرف اپنی زبان ہی سے نہ سمجھے بلکہ عمل سے بھی سمجھے، اس کی مصلحت کو اپنی مصلحت کے مساوی سمجھے، اگر دونوں کی رائیوں میں یا مصلحتوں میں کہیں اختلاف رائے ہو تو اس کو خوش اسلوبی سے حل کرے، یا ایک کو دوسرے پر نہ ترجیح دے، بلکہ اس پر افتراق و مخاصمت کو نوبت حتی الوسع نہ آنے دے، اگر اس کی کوشش کی جائے اور اس سلسلہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت سے رہنمائی حاصل کی جائے تو بہت اصلاح اور بہتری پیدا ہو سکتی ہے اور پھر ملت صرف ترقی ہی نہیں کرے گی بلکہ اس کی نیک نامی اور اچھی شہرت بھی ہوگی، اور ملت کی ترقی اور شہرت کا فائدہ ملت کے افراد ہی کو پہنچے گا۔

غزوہ احد میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحاب سے مشورہ فرمایا کہ مدینہ میں رہ کر دشمن کا مقابلہ کیا جائے، یا مدینہ سے نکل کر دشمن کو باہر ہی سے روکا جائے اور شکست دی جائے، تو مختلف رائے آئیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی رائے کو نظر انداز کر کے اپنے اصحاب کی رائے پر باہر نکل کر مقابلہ کرنے کا ارادہ فرمالیا اور تیاری مکمل کر لی، بعض کی رائے پھر یہ ہوئی کہ مدینہ میں رہ کر ہی مقابلہ کیا جائے، تب آپ نے فرمایا کہ یہ مناسب نہیں کہ طے کر لینے کے بعد پھر تغیر کیا جائے، اب یہی رائے ٹھیک ہے۔

دیگر موقعوں پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قابل مشورہ باتوں میں متعدد بار اپنی رائے پر اپنے صحابہ کی رائے کو ترجیح دی، لیکن جب وحی الٰہی سے یا اندرونی یقین و اعتماد سے کسی بات کا آپ نے فیصلہ فرمایا تو اس میں خواہ تمام صحابہ مختلف رائے رکھتے ہوں آپ ﷺ نے اپنی رائے پر ہی عمل فرمایا جس کی مثال صلح حدیبیہ کا واقعہ ہے۔

اجتماعی زندگی کا تقاضا تعاون اور رواداری سے چلتا ہے کہ ہم دوسرے کی بات کو اگر قبول نہ کر سکیں تو بہر حال اس کی مخالفت اور عداوت نہ شروع کر دیں، بلکہ جہاں تک ممکن ہو محبت اور تعاون کی فضا ہی کو برقرار رکھیں، اس سے اجتماعی اتحاد و اتفاق باقی رہتا ہے اور ملت کامیابی کے راستہ پر چلتی ہے۔

دو وحدتیں

وحدت خداوندی اور وحدت انسانی

امت مسلمہ کو ہم سب کے پروردگار، خالق و مالک کی طرف سے امت دعوت بنایا گیا ہے ﴿کنتم خیر أمة أخرجت للناس تأمرون بالمعروف وتنهون عن المنکر وتؤمنون باللّٰہ﴾ (تم وہ بہتر امت ہو جو لوگوں کے لیے نکالی گئی، تم اچھی باتوں کی تلقین کرتے اور بری باتوں سے منع کرتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو) اس طرح اس امت کو پوری انسانیت کی صلاح وفلاح کا کام سپرد کیا گیا ہے، اس کو اس کے سیدنا خاتم الانبیاء حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے حجۃ الوداع کے موقع پر یہ ہدایت دی گئی ہے کہ "ألا فلیبلغ الشاهد الغائب، فرب مبلغ أوعی من سامع" کہ (میری یہ ہدایات جو میں دے رہا ہوں یہاں موجود لوگ ان لوگوں کو بھی پہنچا دیں جو یہاں موجود نہیں ہیں، کیونکہ بعض وقت وہ لوگ جن کو بات پہنچائی جاتی ہے بات کو سننے والے سے زیادہ سمجھنے اور ماننے والے ہو سکتے ہیں) اور فرمایا: "بلّغوا عنّی ولو آیة" کہ (میری طرف سے پہنچاؤ خواہ ایک آیت ہی ہو)، اور جبکہ امت مسلمہ کے افراد غیروں کی

اکثریت والے علاقوں میں ہوں ان پر یہ ذمہ داری زیادہ عائد ہوتی ہے۔

اسلام اللہ رب العالمین کا عطاء کردہ مذہب ہے اس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس کی بنیاد توحید کے نظریہ پر ہے، توحید یعنی آپس کی وحدت، اور یہ وحدت دو طرح کی ہے، یہ نسلی بنیاد پر بھی ہے اور خدا کی تابعداری اور اطاعت کے لحاظ سے بھی ہے، نسلی لحاظ سے یہ وحدت اس طرح ہے کہ سب انسان ایک ماں باپ یعنی حضرت آدم اور حضرت حواء کی اولاد ہیں جن سے نسل انسانی کا آغاز ہوا، اور سب اسی ایک بڑے اور عالمی خاندان کے فرد ہوئے، اور اس طرح سب آپس میں بھائی بھائی ہوئے، اور اس طرح سب آپس میں برابر ہیں، کوئی بڑا یا چھوٹا نہیں، ہمارا بڑا یا چھوٹا ہونا ہمارے عمل کے اچھے یا برے ہونے کے لحاظ سے ہے رنگ اور نسل کے اعتبار سے نہیں ہے، اور اسی طرح ہم سب ایک خدا کے بندے ہیں، ہمارا پیدا کرنے والا اور ہمارا خدا یعنی اللہ رب العزت ایک ہے، ہم سب کو اور پوری کائنات کو اسی نے بنایا اور ہمارے اچھے اور برے کو وہی سب سے زیادہ جانتا ہے، لہٰذا بندوں کے اچھے اور برے عمل کا تعین اسی کے دیئے ہوئے قانون کے تحت ہوگا، اور ہمارے لیے وہی کرنا مناسب ہے جو اسی خدائے واحد کے فرمان کے مطابق ہو، انسانوں کی یہ دو وحدتیں ہی انسانوں کو ادھر ادھر بھٹکنے سے بچا سکتی ہیں، ہم سب انسان ایک باپ کی اولاد ہیں، لہٰذا ہماری ان سب نسلوں کی اصل و بنیاد ایک ہے اور ہم ایک خدا کے بنائے ہوئے اور پیدا کئے ہوئے ہیں، لہٰذا ہم سب اسی ایک خدا کے ماتحت ہیں اور وہی ہمارے اچھے برے کو سب سے زیادہ جانتا ہے، اسی کے بتائے ہوئے طریقوں میں ہماری خیر اور کامیابی ہے۔

یہ وہ دو وحدتیں ہیں جن کی بنا پر انسان کی زندگی میں یکجہتی پیدا ہو سکتی

ہے اور ان دونوں وحدتوں کی بنیاد پر انسان ادھر ادھر بھٹکنے سے بچ سکتا ہے، اور آپس میں اونچ نیچ اور ٹکراؤ سے محفوظ ہوسکتا ہے، لہٰذا زندگی کے معاملات میں اچھے اور برے طور طریقوں کو ماننے کے لیے اپنے اسی ایک خالق و مالک ہی کے فرمان کو اختیار کرنا ہوگا۔

اسلام میں اس وحدت انسانی اور وحدت خداوندی کے تحت ہم کو جو دستور حیات دیا گیا ہے اس کی دو اہم خصوصیات ایسی ہیں کہ کم از کم ہمارے علم و واقفیت میں وہ دوسرے مذاہب میں نہیں پائی جاتی ہیں، ایک تو یہ کہ اسلام کا یہ دستور حیات اس کے عطاء کرنے والے کے ہی الفاظ میں اور اپنی اصل شکل میں بلا تغیر و تبدل باقی اور جاری ہے، یہ دستور حیات خدائے واحد کے الفاظ میں بھی ہے اور اس کی تفصیل و وضاحت اس کے آخری نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عملی حالات اور زبانی وضاحتوں کی شکل میں بھی ہے اور پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آنے والوں نے ان کو بالکل ان ہی کی شکل میں باقی رکھا اور اپنی طرف سے نہ کچھ بڑھایا اور نہ گھٹایا، بلکہ اس کو بعینہٖ اسی طرح بیان کیا اور صرف اس کی حفاظت و وضاحت پر اکتفاء کی، اور اس کی حفاظت میں صحت و امانت داری اور احتیاط اور اس کے بیان کرنے کے سلسلہ میں پوری تحقیق سے بھی کام لیا، اور انھوں نے یہ کام بڑی محنت سے کیا، کہیں پر اگر سمجھنے یا سمجھانے کے لحاظ سے فرق محسوس ہوا تو اس فرق کو بھی واضح کر دیا تاکہ شک شبہ کی گنجائش نہ رہ جائے، اس طرح اسلام کی تعلیمات اپنے اولین سرمایہ کے مطابق بے کم و کاست صحیح صحیح پوری طرح محفوظ رہیں اور برابر محفوظ ہیں۔

اسلام کی اس مذکورہ خصوصیت کے ساتھ دوسری بڑی اور اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس کی تعلیمات انسانی زندگی کے صرف عقیدہ و عبادت تک ہی محدود

نہیں رکھی گئیں جیسا کہ عام طور پر دوسرے مذاہب میں ہے، بلکہ عقیدہ وعبادت کے ساتھ سماجی اور مالی معاملات اور تمدنی ضروریات تک وسیع رکھی گئی ہیں، اس طرح انسانی زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جس میں ہم کو اسلام کی طرف سے صحیح اور مفید ہدایات نہ دی گئی ہوں، گھر کے اندر شوہر بیوی اور ان کی اولاد کے معاملات ہوں یا بازار میں خرید وفروخت اور مالی لین دین کے ہوں یا غیروں کے آپسی معاملات ہوں، ہم وطن ہم مذہب ہوں یا دوسرے مذہب کے ہوں، سیاست ہو، حکمرانی کے سلسلہ کے معاملات ہوں، حکومت اپنی ہو یا غیروں کی ہو، ان سب میں اسلامی تعلیمات اور ان کے احکام ایسے معتدل اور متوازن انداز کی رہنمائی کرتے ہیں کہ ان سے آپس میں ہمدردی، تعاون اور خیرخواہی اور انسانیت نوازی پوری جھلکتی ہے، اس طرح اسلام انسانیت کے اعلیٰ معیار کا طریقہ کار بن جاتا ہے، اور انسانیت جب حالات کی خرابی کے اثر سے اپنی باعزت سطح سے گر جائے تو اس کو اس سطح سے اٹھا کر اس کی اعلیٰ سطح تک پہنچانے کے لیے سیڑھی کا کام انجام دے سکتا ہے۔

مگر افسوس یہ ہے کہ اسلام کی ان اعلیٰ اور انسانیت نواز صفات وتعلیمات کا عام طور پر مطالعہ نہیں کیا گیا، صرف اپنے پاس پڑوس کے ان مسلمانوں کو دیکھ کر - جو خود اسلامی تعلیمات سے واقفیت حاصل نہ کر سکنے کی بنا پر اپنے پڑوسیوں کو دیکھ کر اپنی زندگی کو ان ہی جیسی زندگی کی طرح گذارنے لگے، رائے قائم کی جارہی ہے، ضرورت ہے کہ اسلام کی ان خوبیوں کو جو انسانیت کے لیے ذریعہ راحت و سہولت اور ذریعہ عزت اور اعلیٰ اخلاق کی حامل ہیں، اور وہ سب قرآن وحدیث سے جو کہ محفوظ ومعتمد سرمایہ ہیں، ماخوذ ہیں لوگوں تک پہنچایا جائے اور ان غلط فہمیوں کو دور کیا جائے جو اسلام کے متبعین یا واقف لوگوں میں نہیں ہو سکتی ہیں۔

اس کے لیے خود اپنوں کو اور غیروں کو ان تعلیمات سے واقف کرانے کے لیے جلسے اور کانفرنسیں اور میڈیا ایک بہترین ذریعہ ثابت ہو سکتے ہیں، ان میں جدید تعلیم یافتہ دانشوروں کو اور اسلامی تعلیمات کی بنیادی سطح سے مہارت کی سطح تک واقفیت پیدا کرنے والے حضرات - جو معتمد درجہ کے علماء دین میں ہیں- کو بھی مدعو کیا جاتا ہے، ان دونوں طبقوں کے یکجا ہو کر اسلام کی انسانیت نوازی اور انسانی زندگی کے لیے اس کے خیر طلبی اور ہمدردی کے مختلف پہلوؤں کو پیش کرنا بہت مفید ہو سکتا ہے، اور اس طرح دونوں طبقوں کی مشترکہ کوشش سے دین وملت ودعوت کی خدمت کا کام بہت اچھے انداز سے انجام دیا جا سکتا ہے۔

باب پنجم

محاسبۂ نفس

- احساس ذمہ داری اور محاسبہ و تجزیہ کی ضرورت
- ذاتی خرابیاں کامیابیوں کی راہ کا پتھر
- ذاتی مفاد پر ملی مفاد کو ترجیح اور احتساب نفس کی ضرورت
- فرض شناسی، ہمدردی اور دیانت داری تین کلیدی صفات
- اکرام مسلم اور احترام انسانیت

احساس ذمہ داری اور محاسبہ و تجزیہ کی ضرورت

امت مسلمہ کو اللہ تعالیٰ نے خیر امت بنایا ہے، لیکن خیر امت کا یہ مقام محض کوئی نام یا تعارف کی علامت نہیں ہے، بلکہ یہ بڑی ذمہ داری اور اہم فریضہ کی ادائیگی کا عنوان ہے، اور وہ یہ ہے کہ حق باتیں جو اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب قرآن مجید اور اپنے رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ ان کو بتائی ہیں ان کو وہ خود بھی اپنی زندگی میں جاری کریں اور دوسروں کو بھی وہ باتیں بتائیں، اور اس بات کی فکر کریں کہ دوسرے ان باتوں کو سمجھیں اور قبول کریں اس میں کسی پر زور و زبردستی کرنا نہیں، بلکہ صرف توجہ دلانے اور دوسروں کے علم میں لانے اور ان کے سمجھنے کے لائق طریقہ سے ان کے لیے واضح کرنے کا فریضہ انجام دینا ہے۔

کسی پر حق باتوں کو ماننے کے لیے زبردستی اور مجبور کر دینے کی ذمہ داری نہیں ڈالی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بتائی ہوئی باتیں خود ایسی جامع اور انسانیت کے لیے فلاح و بہبود کی ہیں کہ عام سمجھ کا انسان بھی ان کو قبول کر لینے میں بہتری محسوس کر سکتا ہے سوائے اس کے کہ وہ صحیح طور پر علم میں نہ آئیں یا کوئی کسی مخالف جذبہ سے نہ ماننے کی ضد پر اڑ جائے۔

اس وقت دنیا میں اسلام اور مسلمانوں کے متعلق جو بدگمانی یا مخالفانہ جذبہ ہے

اس میں عام طور سے خود مسلمانوں کے اس فریضہ کی ادائیگی میں کوتاہی کو دخل ہے جس فریضہ کی ادائیگی ان کے ذمہ کی گئی ہے ورنہ حالات دنیا کے وہ نہ ہوتے جو ہیں، اس کی ایک دلیل یہ ہے کہ دنیا کے مختلف خطوں میں جہاں بھی حق بات کو مناسب اور معقول انداز میں پیش کرنے کا عمل ہو رہا ہے، وہاں اس کا خوش کن نتیجہ سامنے آرہا ہے، خود یورپ اور امریکہ میں جو لوگ دین حق کا تعارف محبت اور ہمدردی سے کراتے ہیں تو اس کے نتیجہ میں ان کی فکر مندی اور نیک عملی اور ان کے کام کی مقدار کے مطابق نتائج بھی سامنے آرہے ہیں۔ ۱۱ ستمبر کے سنگین تباہ کن حادثہ سے پہلے امریکہ میں مسلمانوں سے نفرت کا کوئی جذبہ نہیں تھا اس وقت سالانہ بیس ہزار اشخاص کے اسلام کو ماننے کا اوسط بتایا جارہا تھا۔ ۱۱ ستمبر کا حادثہ کس طرح سے ہوا یہ ابھی تک واضح نہیں ہے، مسلمانوں پر اس کا الزام بھی صحیح نہیں ہوسکتا، اس لیے کہ مسلمانوں کے پاس ایسے وسائل نہیں اور ایسی خصوصی صلاحیتیں نہیں کہ امریکہ جیسے ترقی یافتہ اور حفاظتی انتظام والے ملک میں ایسا بڑا حادثہ کرائیں، بہر حال پروپیگنڈہ چونکہ یہ ہوا کہ یہ حادثہ مسلمانوں نے کیا اس سے امریکہ کے ملک میں مسلمانوں کے خلاف ناراضگی اور ناپسندیدگی کا جذبہ پیدا ہوا، اس جذبہ کا نقصان جو بھی رہا ہو لیکن اس سے یہ نئی بات ہوئی کہ امریکی پڑھے لکھے لوگوں کو مسلمانوں اور ان کے مذہب کے بارے میں تجسس ہوا کہ یہ برے لوگ کون ہیں، ان کو ان کا مذہب کیا سکھاتا ہے، چنانچہ ان میں سے بہت سے لوگوں نے اسلام اور مسلمانوں سے متعلق کتابوں کا مطالعہ کیا اور واقفیت ہوتے ہی ان میں سے بہت سے لوگوں میں نفرت پسندیدگی میں تبدیل ہوگئی اور سال بھر میں بجائے بیس ہزار کے چالیس ہزار غیر مسلموں نے اسلام کو پسند کرلیا، اس مثال سے اسلام کی حقانیت کی کشش کا اندازہ ہوتا ہے کہ ایک دو نہیں اتنی بڑی تعداد میں لوگ حقیقت سے واقف ہوجانے پر دشمنی سے محبت و پسندیدگی میں تبدیل ہوگئے، اور اب جو نئے اعداد و شمار آئے ان سے اندازہ ہوا کہ وہ سابقہ اوسط جو

بیس ہزار کا تھا وہ چالیس ہزار کا ہو گیا۔

اگر مسلمان دعوت کے فریضہ کو اپنی زندگیوں کو اسلامی سیرت کا نمونہ بناتے ہوئے انجام دیں تو اس کے بڑے اچھے نتائج نکل سکتے ہیں اور ان کے مصائب اور پریشانیوں میں بہت کمی آسکتی ہے اور وہ اس سے عند اللہ سرخرو اور کامیاب بھی ہوں گے، اور یہ جو سیاسی سطح پر مسلمانوں کے ساتھ مختلف ملکوں میں واقعات پیش آرہے ہیں ان کے نقصانات بھی کم ہوں گے کیونکہ سامنے سے اسلام اور مسلمان دشمنی کی کیفیت ہٹ جائے گی اور مسئلہ خالص سیاسی یا معاشی رہ جائے گا جس کی حقیقت کو سمجھتے ہوئے مناسب حکمت عملی سے ان کو روکنے کی کوشش کی جاسکتی ہے، مسلمانوں میں اگر اپنے پروردگار کی اطاعت اور دین حق کی نصرت کا صحیح جذبہ ہو اور اس کی صحیح فکر ہو اور اس پر ہمدردی اور انسانی خیر خواہی کے بتائے ہوئے جذبہ سے عمل ہو تو مسلمانوں کے مخالفوں میں بھی مسلمانوں سے نفرت کا جذبہ نہیں رہے گا، پھر مسئلہ صرف کاروباری اور دنیاوی فائدے کے حصوں کا رہ جائے گا اور اس کا مداوا زیادہ مشکل نہیں۔

مشرق وسطیٰ میں مغربی سامراجی طاقت کی طرف سے جو ہوا ہے، اس کے پیچھے اصلاً سیاسی اور اقتصادی فائدہ اٹھانا مقصود ہے اور چونکہ وہاں کی قومیں مسلمان ہیں اور میڈیا نے مسلمانوں کو خاص طور پر بدنام کیا ہے اس لیے ان میں اسلام دشمنی کا رویہ بھی شامل ہو گیا ہے، ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم واقعات کو ان کے صحیح پس منظر میں دیکھیں، مشرق وسطیٰ کے یہ مسلمان حکومتوں کے ذمہ دار خواہ فوجی زمرہ کے ہوں یا سیاسی زمرہ کے ہوں سب مغربی تعلیم وتربیت کے پروردہ ہیں جن کو مغربی سیاست دانوں اور دانشوروں سے زیادہ عقیدت ہے اور اسلام کو وہ اپنا آبائی مذہب سمجھتے ہوئے صرف قومی جذبہ سے دلچسپی رکھتے ہیں، اس لیے مغربی حکومتوں کے سیاست داں اور دانشور، ان کو آسانی سے اپنا آلہ کار بھی بنا لیتے ہیں اور کم از کم اپنی حکمت عملی سے ان سے فائدہ اٹھا لیتے ہیں، اس

لیے بھی مغربی طاقتوں کو ان خطوں میں کامیابی حاصل کرنے میں کوئی بڑی دشواری نہیں ہوتی۔ پھر مزید یہ کہ ساری مشرقی حکومتوں کو مغربی سامراجی حکومتوں نے اپنے اقتصادی جال میں اس طرح پھنسالیا ہے کہ وہ زیادہ ان کے خلاف جانہیں سکتے، زبردست قرض لے کر اور اس کا زبردست سود ادا کرنے کے چکر میں اپنے ملک کو مضبوط کرنے اور اپنی پوزیشن کو خوددار اور پُرعزم بنانے سے قاصر رہتے ہیں اگر مغربی طاقتوں کی مخالفت بھی کرتے ہیں تو وسائل کی کمی کی وجہ سے اس میں زیادہ آگے نہیں جاپاتے۔

ضرورت ہے کہ مسلمان قوم حق کی پابند اور اپنی عزت وعظمت جو خدا کی طرف سے ان کو دی گئی ہے اس کے لیے اس کا لحاظ اور اپنے اقدامات میں عزیمت اور حالات کا صحیح جائزہ لے کر حق پرستانہ حکمت عملی اختیار کریں تو ان کو وہ پریشانیاں پیش نہ آئیں گی جن سے وہ دوچار ہوتے رہتے ہیں، ہماری مسلم حکومتوں کے ذمہ دار اسلام کا نام لیں یا نہ لیں حقیقت میں ان کے دلوں میں مغربی سیاست دانوں اور دانشوروں کی وقعت زیادہ ہے اور ان سے رابطہ بھی ان کا زیادہ رہتا ہے اور ان کے حالات کے خلاف کچھ کرنے کی ہمت بھی کم پڑتی ہے ایسی صورت میں بہت خوشگوار نتائج کے حاصل ہونے کی امید بہت کم ہے۔ ضرورت ہے کہ مسلمانوں میں اپنی دینی واسلامی ذمہ داری کا تصور بڑھایا جائے اور ان کو اپنے دین پر صحیح عمل کرنے کے لیے تیار کیا جائے، اور اسلام کے مخالفوں کے مکر وفریب کو بھی سمجھا جائے۔ اس میں جس قدر بھی کامیابی حاصل ہوگی اسی قدر مرض کا مداوا ہوگا اور عزت حاصل ہوگی۔

ذاتی خرابیاں کامیابیوں کی راہ کا پتھر

دنیائے اسلام میں اس وقت ایک طرف تو اسلامیت کے اثرات ابھر رہے ہیں، مسلمانوں میں اپنے شاندار ماضی کی طرف لوٹنے کی تڑپ پیدا ہو رہی ہے اس کے اثر سے جگہ جگہ تحریکیں اور انجمنیں کام کرنے لگی ہیں اور جگہ جگہ اسلام کو اس طرح نافذ کرنے اور اس کا نظام قائم کرنے کا مطالبہ شروع ہو گیا ہے جس طرح وہ عہد اول میں نافذ کیا گیا تھا، اور اس سے مسلمانوں کو ایسی سربلندی اور سرفرازی ملی تھی جو رہتی دنیا تک ایک مثالی دور کی حیثیت سے یاد کی جاتی رہے گی اور جس کو اپنے تو اپنے غیر بھی تسلیم کرتے ہیں، گاندھی جی نے بھی ہندوستان کے آزاد ہونے پر حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ کے انداز حکومت کا حوالہ دے کر بات کہی تھی۔

اسلامیت کی یہی لہر تھی جس نے افغانستان کے مسئلہ کو سارے عالم اسلام کا مسئلہ بنا دیا اور بالآخر وہاں کا جہاد کامیابی پر ختم ہوا، اور صرف یہی نہیں بلکہ اس نے روس جیسی چوٹی کی طاقت کی چولیں ہلا دیں اور اس کا شیرازہ خود اس کے ہاتھوں بکھر گیا، یہی لہر ہے جو شمالی افریقہ کے علاقوں میں وسط ایشیا اور مغربی ایشیا کے خطوں میں جگہ جگہ ایک اضطراب پیدا کیے ہوئے ہے، اور وہ ایک ایسی

حقیقت کے طور پر کام کر رہی ہے کہ اس کو روکنے والے اس کے سامنے زیادہ ٹھہر نہیں سکتے۔ حالات واضح اشارہ دیتے ہیں کہ ان کو اس سے صلح کرنا ہوگا ورنہ اس کے ریلے میں وہ بہہ جائیں گے، کیونکہ وہ کوئی مصنوعی جوش نہیں وہ دراصل صدیوں سے دبی ہوئی کچلی ہوئی طلب وتمنا ہے جو مسلمانوں کے زوال اور ان کی قوتوں کے اضمحلال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مغربی استعمار (سامراج) نے دبا رکھی تھی اور یہ سمجھ لیا گیا تھا کہ اس کو ختم کر دیا گیا ہے، اب مغربی استعمار کی گرفت ڈھیلی ہونے پر وہ طلب وتمنا ابھر آئی ہے اور وہ کام کر رہی ہے اور کرتی رہے گی، دنیا کی طاقتوں کو اس حقیقت کو ماننا ہوگا اور جو نہ مانے گا اسکو شکست دیکھنا ہوگی جس طرح روس اور کیمونزم نوازوں نے افغانستان میں دیکھی۔

اس اسلامی لہر سے مسلمانوں کو ایک مسرت بھی ہے اور توقعات بھی، لیکن دوسری طرف ایک حقیقت اور بھی ہے جو خود مسلمانوں کے لیے نظر انداز کرنے کی نہیں ہے اور ان کی کسی ملی لہر کے کامیاب ہونے کے لیے اس حقیقت کا اعتراف اور اس کے مطابق ضروری عمل اختیار کرنا از حد ضروری ہے وہ حقیقت ہے خود مسلمانوں کی اپنے اندر کی کمزوری اور ان کی ذاتی زندگیوں میں اسلام کی تعلیمات اور احکامات پر عمل نہ کرنے کی عادت اس کمزوری کی صورت میں مسلمان کی تلوار بجائے لوہے کے لکڑی کی ثابت ہوگی اس کی قوت بے تاثیر ثابت ہوگی ہماری پوری ملت اس وقت اسلامی تعلیمات کے لحاظ سے ان تمام کمزوریوں میں مبتلا ہے جو مسلمانوں کے اعلیٰ مقاصد اور آرزوؤں کے ساتھ جوڑ نہیں کھاتیں، ہم خود غرضی اور ذاتی مفاد کی ترجیح میں اس طرح مبتلا ہیں جیسا کہ چھوٹے بچے مبتلا ہوتے ہیں چھوٹے سے چھوٹے ذاتی فائدہ کے لیے اور چھوٹی سے چھوٹی چیز کے لیے ہم اسلامی قدروں کو بے تکلف قربان کر دیتے ہیں اور قرآن وحدیث میں جن باتوں

کو حرام کاموں میں شمار کیا گیا ہے اور جن پر وعیدیں آئی ہیں وہ ہمارے عمل میں عام طور پر پائی جاتی ہیں حصول مال میں حرام وحلال کی تمیز نہ کرنا، چھوٹے سے چھوٹے نجی مفاد کے لیے ملی مفاد کو قربان کر دینا، معمولی سے معمولی جاہ کے لیے سب کچھ کر ڈالنا، معمولی سے معمولی فائدے کے لیے جھوٹ بول دینا، دھوکہ دے دینا، دوسرے کے حق کو دبا لینا اس کی اہانت کر دینا بلکہ اس کو شدید نقصان پہنچا دینا، جھوٹی عزت وشہرت کے لیے بے دریغ پیسہ خرچ کرنا اور خوب اسراف کرنا، ملت کے لیے تھوڑا خرچ کرنے میں بھی کوتاہی کرنا اور اتحاد واتفاق کو چند روز سے زیادہ نہ چلنے دینا، عام وطیرہ بنتا جا رہا ہے، اور تمدن وعلم سے حاصل کردہ اپنی صلاحیتوں کے ذریعہ سب کو سمجھا دینا کہ ہم جو کچھ کر رہے ہیں ملت کے مفاد کے لیے اور اللہ اور اس کے رسول کی تعلیمات کے مطابق ہی کر رہے ہیں۔

ہم مسلمانوں میں ان امراض کے ہونے سے دو بڑے نقصانات ہیں ایک تو یہ کہ یہ انداز کامیابی اور ترقی کے نہیں ہیں ان سے وقتی اور انفرادی فائدہ جس کو جتنا بھی ہو جائے بالآخر انجام برا ہوتا ہے اور سب کیا کرایا اکارت ہو جاتا ہے، آپس کی ہمدردی میں سچائی، امانت داری، محنت وقربانی، تواضع وہ صفات ہیں جو جس قوم میں ہوں گی وہ ترقی کے زینے طے کرے گی، اور اگر اس کے خلاف ہوگا تو وہ بالآخر ناکام ونامراد ہو جائے گی پھر ان کمزوریوں کی صورت میں غیر مسلموں کے سامنے ہماری تصویر بڑی خراب آتی ہے اور ہماری تصویر ان کے سامنے خراب آنے کا مطلب ہے کہ اسلام کی صحیح تصویر ان کے سامنے نہیں آتی، مسلمانوں کو امت دعوت بنایا گیا تھا یعنی خاتم الرسل حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ان کے امتیوں پر اس دعوت کی ذمہ داری آ چکی ہے جو وہ دیتے تھے، اب ہم جب خود ان تمام خرابیوں میں مبتلا ہوں جن سے دوسروں کو نکالنے کے لیے ہم

کو مامور کیا گیا ہے تو ہم کیسے ان کو ان خرابیوں سے نکالیں گے، جب کہ ہم اپنے عمل سے بہت خراب نمونہ پیش کر رہے ہیں۔ اس طرح دراصل ہم امت دعوت نہیں رہ جاتے بلکہ امت اضلال وافساد بن جاتے ہیں یہ بات سوچنے اور غور کرنے کی ہے۔

دوسرا نقصان یہ ہے کہ ہماری اس زندگی کی صورت میں اللہ تعالیٰ کی نصرت ہم کو نہ مل سکے گی، اللہ تعالیٰ کی نصرت کوئی سستی چیز نہیں ہے کہ بلاوجہ آجایا کرے، وہ معیار دیکھ کر آتی ہے، وہ بدر میں آئی جب مسلمانوں نے اپنے اعلیٰ معیار کا ثبوت دیا جس میں ان کی پاکیزہ زندگیاں اور اپنے رسول کی جو کہ اس وقت قائد حرب بھی تھے اور مکمل اطاعت بلکہ والہانہ تابعداری تھی' اسی طرح اس عہد میں مختلف موقعوں پر آئی کیونکہ وہ اعلیٰ معیار کو قائم رکھے ہوئے تھے' اور جب کسی وقت ان کے اس اعلیٰ معیار میں ذرا سا بھی ڈھیلا پن پیدا ہوا ان کی فوراً سرزنش بھی کردی گئی جیسا کہ احد کے موقع پر پیش آیا۔ اب ہم ذرا اپنی زندگی کو دیکھیں پھر غور کریں کہ ہماری مشکلات اور مصیبتوں میں ہماری ملی پیچیدگیوں کے حل میں اور ہماری ملت کے مخالفوں سے مقابلہ کرنے میں کیا ہم کو اللہ کی نصرت مل سکتی ہے اور ہم اپنے مسائل کے حل میں وہ آسمانی مدد حاصل کر سکتے ہیں، جو ہم کو اچھی اور صالح زندگی کی صورت میں ملا کرتی ہے، تمناؤں اور اسلام کا دعویٰ کرنے سے کام نہیں چلتا، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿لَيْسَ بِأَمَانِيِّكُمْ وَلَا أَمَانِيِّ أَهْلِ الْكِتَابِ مَنْ يَعْمَلْ سُوءًا يُجْزَ بِهِ وَلَا يَجِدْ لَهُ مِنْ دُونِ اللَّهِ وَلِيًّا وَلَا نَصِيرًا﴾ (سورہ نساء:۱۲۳)

"(نجات) نہ تو تمہاری آرزوؤں پر ہے اور نہ ہی اہل کتاب کی

آرزوؤں پر جو شخص برے عمل کرے گا اسے اسی (طرح) کا
بدلہ دیا جائے گا اور وہ خدا کے سوا نہ کسی کو حمایتی پائے گا اور نہ
مددگار۔"

ہماری ذاتی زندگیوں کے اندر کی خرابیاں اور اسلامی تعلیمات سے روگردانی ہماری کوششوں کی کامیابی کے راستہ کا سب سے بڑا پتھر ہیں وہ جب تک نہ ہٹایا جائے گا کامیابی مشکل ہے ہمارے قائدین اور رہنماؤں کو اس طرف خصوصی دھیان دینے کی بڑی ذمہ داری ہے ان کو اس پہلو کی اصلاح کی فکر زیادہ کرنا چاہیے تاکہ کامیابی کے راستے کا یہ بڑا پتھر ہٹایا جائے اور راستہ کھل جائے اللہ تعالیٰ کی نصرت کا، ملت کے آگے بڑھنے اور اتحاد و اتفاق سے کام کرنے کا اور فلاح و کامیابی کا۔

اس اصلاح کے لیے صرف کہنا سننا کافی نہیں اس کے لیے خاموش عملی جدوجہد کی زیادہ ضرورت ہے لیکن افسوس ہے کہ پورے عالم اسلام میں اس پہلو میں خاصی کوتاہی ہے اسی لیے ہم دیکھ رہے ہیں کہ تمام عالم اسلام میں مسلمانوں کی طرف سے جو جدوجہد ہو رہی ہے اور جو قربانیاں دی جاری ہیں ان کے نتائج اتنے نہیں نکل رہے ہیں جتنی قربانیاں دی جا رہی ہیں اور جتنی محنت کی جا رہی ہے، اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس پہلو کو سمجھنے کی توفیق عطاء فرمائے (آمین)

ذاتی مفاد پر ملی مفاد کو ترجیح

اور احتساب نفس کی ضرورت

مسلمانوں کی آبادی اب دنیا کے تقریباً ہر ملک میں پائی جاتی ہے، اور وہ ملک جن میں وہ اکثریت میں ہیں ایک معتد بہ تعداد رکھتے ہیں، یہ تعداد ایسی ہے کہ بین الاقوامی سیاست اور دیگر معاملات میں نظر انداز نہیں کی جاسکتی، مسلمانوں کے یہ ملک اقتصادی لحاظ سے بھی مضبوط ہیں ان میں سے متعدد ملک اپنے معدنی ذخائر کے لحاظ سے دنیا کے اولین ملکوں میں شمار کئے جاتے ہیں اور ان کے بعض بعض ذخائر ایسے ہیں کہ دنیا کے انتہائی بڑے ملک اپنے کو ان کا محتاج محسوس کرتے ہیں، مسلمان اگر امت واحدہ کے طور پر کام کریں تو دنیا کی بین الاقوامی سیاست اور رائے عامہ ان کی مرضی کے خلاف نہیں ہوسکتی، ان کی رعایت کے بغیر دنیا کا کوئی کام انجام نہیں پاسکتا۔

مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو دین عطاء کیا گیا ہے، وہ تمام انسانیت کی فلاح اور صلاح کا ضامن ہے وہ نہ صرف خود مسلمانوں کی عزت وقوت

کا باعث ہے، بلکہ ساری دنیا کی عزت وقوت کا سرچشمہ یہ دین بن سکتا ہے، لیکن اس امر کی طرف توجہ تمام دنیا کو کیا خود مسلمانوں کو بھی نہیں ہے، وہ نہ اپنے دین کی اہمیت کو سمجھتے ہیں اور نہ بحیثیت ایک بین الاقوامی اور عظیم تر ملت ہونے کے اپنی طاقت کو سمجھتے ہیں، وہ اپنے دین کی اس اہمیت اور اپنی عظیم طاقت سے فائدہ اٹھانے اور دوسروں کو فائدہ پہنچانے کی طرف کوئی دھیان نہیں دیتے اور اس کے لئے جو سودمند طریقہ ہے اس کو اختیار نہیں کرتے اور دوسروں کو بھی اس کی اہمیت سے واقف نہیں کراتے، یہ وقت کا اہم تقاضہ ہے کہ وہ خود بھی اس سے صحیح فائدہ اٹھائیں اور دوسروں کو بھی اس کی اہمیت وافادیت سے واقف کرائیں، مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے امت دعوت بنایا گیا ہے، ان کی افادیت اس پانی کی طرح ہے جس سے انسانوں کی پیاس بجھتی ہے، اور خشک کھیتیاں سیراب ہوکر سرسبز و شاداب ہوتی ہیں لیکن اس وقت مسلمان خود اپنی پیاس نہیں بجھا پا رہے ہیں، اور خود اپنی کھیتیوں کو سرسبز وشاداب نہیں بنا پا رہے ہیں، اس وقت دنیا کے ملکوں میں کم ایسے ملک ہوں گے جہاں مسلمانوں پر بحیثیت مسلمان زمین تنگ نہ ہو، ان کو بے بسی اور لاچارگی کا سامنا نہ ہو۔ ان کا حال یہ ہوگیا ہے کہ جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں وہاں ان کو سیاسی اور اقتصادی دشواریوں اور مصیبتوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے اور جہاں مسلمان اکثریت میں ہیں وہاں ان کو اپنے دین پر صحیح طور پر عمل کرنے اور اس کو نافذ کرنے میں طرح طرح کی دشواریاں پیش آرہی ہیں۔

یہ صورت حال اگر مسلمان ایک کمزور، بے قیمت اور وسائل زندگی سے محروم قوم ہوتے تو سمجھ میں آسکتی تھی یا ان کی تعداد بہت کم ہوتی تو سمجھ میں آسکتی تھی، لیکن ان کے موجودہ حجم کی صورت میں کہ دنیا کی پانچ ارب آبادی میں وہ ایک ارب سے زیادہ ہیں۔ دنیا کے سیاسی طور پر ڈیڑھ سو تسلیم شدہ ملکوں میں ایک

تہائی کے قریب ہیں۔ متحدہ اقوام میں وہ جس رائے کی طرف ہو جائیں اس رائے کا ناکام ہونا ممکن نہیں۔ وہ دنیا کے ملکوں کی برادری میں کوئی ایک موقف اپنائیں تو ان کے موقف کو گرایا نہیں جا سکتا، وہ اپنی زمینی دولتوں کو صحیح ڈھنگ سے استعمال کریں تو دنیا کے بڑے بڑے ملک ان کے قدموں پر گر جائیں گے۔ وہ متحد کر اپنی سیاست بنائیں تو دنیا میں کوئی بڑا فیصلہ ان کی رائے معلوم کئے بغیر نہ ہو سکے گا۔

لیکن ہو کیا رہا ہے؟ مسلمانوں کی ان تمام طاقتوں اور صلاحیتوں کے باوجود ان کے برعکس حالات میں جو چھوٹے سے چھوٹا گروہ بھی آپس میں کئی ٹکڑیوں میں بٹا ہوا ہے اور ایسی عداوت کہ دشمن سے بھی نہ ہوگی۔ بھائی بھائی سے جدا ہے، بلکہ اس کو گرانے اور شکست دینے کی خاطر دشمن سے بھی مدد لے لیتا ہو۔ اسلام کی عزت ملت کی عزت اور ادارہ کی عزت کے بجائے صرف اپنی عزت کی فکر میں لگا ہوا ہے۔ وہ اپنی عزت کے لئے خواہ وہ صرف دکھاوے کی اور جھوٹی عزت ہو اپنے خاندان کی اپنی ملت کی عزت کو برباد کر سکتا ہے، افراد سے لے کر اداروں، حکومتوں اور بین الاقوامی برادری تک بھی مسلمانوں کا یہ طرزِ عمل نظر آ رہا ہے، ایسی صورت میں اس قوم کی ترقی و کامیابی کی اچھی توقعات کہاں قائم کی جا سکتی ہیں، لیکن اس سب کے باوجود اس عظیم دین کے تابعداروں کے لئے مایوسی کی بات نہیں ہے۔ اس میں امید کی کرن ان اسلامی تعلیمات میں ہے جو ہم کو قرآن کریم و حدیث سے ملتی ہیں۔ ان کو اگر ہم اپنا سکیں تو ہم اپنی تمام کمزوریوں کو دور کر سکتے ہیں، اور مسلمانوں کی تاریخ میں بار بار پیش آیا ہے کہ امت اتنی گر گئی کہ اس کا اٹھنا دشوار محسوس ہونے لگا، اتنے میں خدا کا ایک بندہ اٹھا اور اس نے اللہ اور اس کے رسول کے بتائے ہوئے طریقہ پر چلتے ہوئے اصلاح کی جدوجہد کی اور وہ جدوجہد

کامیاب ہوئی، اسی لئے یہ امت اتار چڑھاؤ سے تو گذری لیکن ختم یا تباہ نہ ہوئی۔

آج ضرورت ہے کہ ہم غور کریں کہ ہم اپنی ان کمزوریوں کو کیسے دور کر سکتے ہیں، جو ہم کو تباہی و بربادی میں ڈالے ہوئے ہیں، ہم کو چاہئے کہ ہم ان کمزوریوں کی اصلاح کی فکر کی طرف جلد ہی توجہ کریں، باہر کے دشمن سے لڑنے سے قبل ہم کو اپنے اندر کے دشمن سے لڑنا ہوگا۔ بخار میں مبتلا آدمی کو پہلے اپنے بخار کو دور کرنے کی فکر کرنا چاہئے تاکہ وہ صحت کے ساتھ طاقت آزمائی میں مضبوط ثابت ہو سکے۔ ہماری طاقت وعظمت کا راز اس میں پوشیدہ ہے کہ ہم ﴿تَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ﴾۔

کہ نیکی کے کام میں اور تقویٰ واحتیاط کے سلسلہ میں آپس میں تعاون کرو۔ معصیت کے کام اور دوسرے پر زیادتی کے سلسلہ میں تعاون نہ کرو۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا قول ہے:

"لا تباغضوا ولا تحاسدوا ولا تدابروا ولا تقاطعوا وكونوا عباد الله إخوانا"

"آپس میں غصہ نہ کرو اور نہ آپس میں حسد کرو، اور نہ سازش کرو اور نہ آپس میں مقاطعہ کرو اور اللہ کے بندے بھائی بھائی بن جاؤ"

ہم تنہا ان دو نصیحتوں کو اپنے سامنے رکھیں اور اپنی زندگی کو ان کے مطابق ڈھالیں تو ہماری وحدت مضبوط دیوار کی طرح بن سکتی ہے۔ ہماری طاقت ناقابل شکست چٹان بن سکتی ہے، ہمارا معاشرہ شاندار سیرت و کردار کا معاشرہ بن سکتا ہے کہ جس کو دیکھ کر ہمارے دشمن رشک کریں اور صرف رشک ہی نہیں بلکہ اس کی طرف

مائل ہونے اور اس کی نقل کرنے کی طرف لپک کر بڑھیں اور ہماری رہنمائی اور سرپرستی میں اپنے کو دے دینے کے خواہش مند ہوں، کیا ایسا ہمارے ماضی میں نہیں ہوا؟ کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ۲۳ سال کے عرصہ میں جو معاشرہ تربیت دے کر تیار کیا تھا اس معاشرہ نے دنیا کے ایک بڑے حصہ کو اپنا گرویدہ اور نیاز مند نہیں بنالیا؟ حالانکہ ان کی مادی طاقت اپنے دشمنوں کی مادی طاقت سے کم تھی، ان کی تعداد ان کے دشمنوں کی تعداد سے کم تھی، ان کے وسائل و سامان زندگی اپنے دشمنوں کے وسائل اور سامان زندگی سے کم تھے، لیکن ان کے پاس ایمان کی طاقت تھی، بے غرضی اور اخلاص کی طاقت تھی۔ اللہ کے حکم کے سامنے سر جھکا دینے اور خواہش نفس پر غالب رہنے کی طاقت تھی، اور آج ہمارے پاس یہ طاقتیں موجود نہیں، ہم خدا کے حکم اور ملت کے مفاد کے لئے اپنی اندرونی خواہش و جذبہ کو بھی قربان نہیں کر سکتے۔

ہمارے کسی معمولی ذاتی مفاد کا نقصان ہو یا اپنی جھوٹی عزت کے کسی جزو کو دھکا پہنچتا ہو تو ہم شریف سے شریف آدمی کو ذلیل کر کے رکھ دیں۔ ملت کے بڑے سے بڑے مفاد کو قربان کر دیں۔ خدا و رسول کے اہم سے اہم حکم کو پامال کر دیں۔ ایسی صورت میں نتیجہ معلوم ہے کہ پہلے ملّت کی تباہی پھر اس کے افراد کی بربادی اور ذلت۔ آج افسوس کی یہی بات ہے کہ امت اسلامیہ بین الاقوامی، پھر بین المملکی، پھر من حیث الجماعت پھر من حیث الافراد' اسی ذلت و نکبت میں مبتلا نظر آ رہی ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ فرمان آج کے حال پر منطبق ہو رہا ہے کہ " أنتم غثاء كغثاء السيل " کہ تم تعداد کی زیادتی کے باوجود سیلاب کے لائے ہوئے جھاگ کی طرح ہو گے۔ یعنی دیکھنے میں بہت لیکن حقیقت و افادیت میں کچھ نہیں۔

فرض شناسی، ہمدردی اور دیانت داری

تین کلیدی صفات

اجتماعی زندگی میں درستگی اور خوبی کے لئے تین صفات بنیادی اہمیت رکھتی ہیں، ایک فرض شناشی، دوسرے ہمدردی اور تیسرے دیانت، اگر ان تینوں باتوں کا لحاظ نہ رکھا جائے تو اجتماعی زندگی پریشانی اور مصیبت کی آماجگاہ بن جاتی ہے، اسلام میں ان تینوں باتوں کی طرف توجہ دلائی گئی ہے اور تاکید کی گئی ہے اور حضور ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں یہ تینوں باتیں بطریق احسن پائی جاتی تھیں، اور ان کی بنیاد اللہ کا خوف اور آخرت میں کامیابی کی طلب ہوتی تھی، اسی لئے ان کا معاشرہ بڑا مثالی معاشرہ تھا، آپس کی محبت، ہمدردی اور دیانت داری ان کی عام صفات تھیں، اللہ کا خوف اور آخرت کی فکر جیسے جیسے کم ہوتی گئی مسلمانوں میں ان صفات کی کمی ہوتی گئی، اور ان کی اجتماعی زندگی ابتر ہوتی چلی گئی، ضرورت ہے کہ ان صفات کو رواج دینے اور عمل کا جزو بنانے کی فکر کی جائے، اور معاشرہ کو درست بنایا جائے۔ ملحد اور کافر قوموں میں اللہ کا خوف اور آخرت کی فکر نہیں ہوتی ہے، لیکن یورپ کی موجودہ متمدن قوموں میں فرض

شناسی، ہمدردی، تعاون و دیانت کی ظاہری شکلیں خاصی نظر آتی ہیں، دراصل اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے بیشتر افراد تعلیم یافتہ ہونے کے باعث اپنی اجتماعی زندگی کو خوبصورت اور منظم بنانے کی فکر کرتے ہیں، ان کے پاس خوفِ خدا اور تصورِ آخرت نہیں ہے، انہوں نے اس کمی کا حل دوسرے طریقہ سے نکالنے کی کوشش کی ہے، انہوں نے خوفِ خدا کی جگہ حکومت اور قانون کی گرفت کے خوف کو جگہ دی ہے، اور آخرت کی فکر کی جگہ اپنے ذاتی اور اجتماعی نفع وضرر کی فکر کو جگہ دی ہے، اس طریقہ سے وہ اپنی اجتماعی زندگی اپنے مطلب کی حد تک سنبھالنے کے قابل ہوگئے، ضروری کام کے لئے فرض شناسی اس لئے اختیار کی جاتی ہے کہ اس کے بغیر زندگی کی گاڑی نہیں چل سکتی ہے، وہاں ایک شخص دوسرے شخص کا تعاون اس لئے کر رہا ہے کہ اپنی ضرورت پڑنے پر اس کو دوسرے کے تعاون کی ضرورت پڑتی ہے، اس کے حصول کے لئے دین کے طریقہ سے مفر نہیں، وہ دوسرے کے ساتھ اگر کوئی ہمدردی کرتا ہے تو، یا تو اس لئے کہ اس کے کسی ذاتی مقصد کی برآوری ہوتی ہے یا ہمدردی نہ کرنے پر سوسائٹی کی نظروں میں اس کو رسوائی کا خطرہ ہوتا ہے۔

جہاں تک دیانت کا تعلق ہے تو وہ صرف قانون کی پکڑ سے بچنے کے لئے یا رائے عامہ کے دباؤ سے اور سوسائٹی کی نظر تنقید سے بچنے کے لئے اختیار کرتا ہے۔ اگر ان دونوں باتوں میں مفر کی صورت نکلتی ہے تو وہ بددیانتی سے بالکل نہیں بچتا، چنانچہ مغربی سوسائٹی میں اس کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں کہ جب بھی بددیانتی کی پکڑ سے محفوظ موقع ملا تو کھل کر بددیانتی کی گئی، نیویارک میں ایک رات چند گھنٹوں کے لئے بجلی چلی گئی تو اندھیرے کی آڑ میں دوکانوں کے دروازے توڑ توڑ کر ہر طرح کا سامان اٹھالے گئے، اور پولیس کی زد میں آئے تو

ناگواری کا اظہار کیا۔

امریکہ میں کسی اخبار نے یہ سوال نامہ شائع کیا کہ اگر آپ کو پکڑ دھکڑ کا خطرہ نہ ہو اور چوری کا موقع ملے تو کیا آپ چوری کریں گے تو بھاری اکثریت کا جواب تھا ضرور کریں گے۔ یہ ان کی حقیقت گوئی تھی کیوں کہ پکڑ یا دباؤ کے خطرے کے معدوم ہونے کی صورت میں بددیانتی نہ کرنا ان کی نظر میں بے وقوفی سے زیادہ نہیں۔

وہاں کی حکومتیں ان تصورات کو جانتی ہیں، اسی لئے وہ اسی کے مطابق انتظامات بھی کرتی ہیں، اور اسی کے مطابق ضابطہ وقانون بھی بناتی ہیں، اور اس طریقہ سے سوسائٹی کے ظاہری عمل کو کنٹرول کر لیتی ہیں، جس کی وجہ سے ان کی اجتماعی زندگی کا ظاہری رنگ وروپ بہت بھلا ظاہر ہوتا ہے، چھوٹی موٹی اور گھٹیا قسم کی بددیانتیاں مغربی تمدن میں بہت کم ہوتی ہیں، کیونکہ ان سے فائدہ کم اور سوسائٹی میں رسوائی کا نقصان زیادہ ہوتا ہے، چنانچہ سڑک پر معمولی اشیاء کی دکانوں پر بعض وقت مال بغیر محافظ کے ہوتا ہے، اور لوگ قیمت رکھتے جاتے ہیں اور مال اٹھا لیتے ہیں، مثلاً اخبارات کے فروخت میں یہ طریقہ اختیار کیا جاتا ہے، وجہ یہ ہوتی ہے کہ اردگرد سیوں آدمی آتے جاتے دیکھ رہے ہوتے ہیں، لیکن جب بھی کسی کو کوئی محفوظ موقع مل گیا تو وہ اس سے پورا فائدہ اٹھاتا ہے، مغربی تمدن میں قانون وحکومت کی گرفت کے ساتھ صحافت کی طرف سے بھی گرفت کا نظام ہے، اور اس معاملہ میں صحافت برابر کا کام انجام دیتی ہے، اگر کسی فرم کی طرف سے خراب مال بنایا جارہا ہو اور بدمعاملگی ہوتی ہو تو فوراً صحافت اس کی گرفت کرتی ہے، اور عوام کے سامنے اس کا قضیہ لے آتی ہے، اس کی وجہ سے کاروبار میں دیانت واحتیاط کا لحاظ رکھا جاتا ہے۔

یہ حالات ہیں بے خدا زندگی کے جن میں دین کی گرفت کے نہ ہونے سے دنیاوی تدابیر سے کام لیا جاتا ہے، کم از کم ظاہری سطح پر اچھے نتائج حاصل کر لئے جاتے ہیں، لیکن ہمارا مشرقی ماحول اتفاق سے دونوں عوامل سے خالی ہو چکا ہے نہ تو اس میں دین کا اتنا اثر ہے کہ وہ غلط کاموں اور خود غرضیوں سے روکے اور کہیں پایا جاتا ہے تو اس کی تعداد کم ہے۔ جو معاشرہ کو اچھا نہیں بنا پاتا اور اس حقیقت کو مان کر اس کا متبادل دنیاوی طریقہ اختیار کرنے کی طرف بھی توجہ نہیں کی جاتی، چنانچہ ہماری اجتماعی زندگی میں تعاون، ہمدردی اور دیانت تینوں باتوں کی مثالیں کم ہوتی جارہی ہیں، البتہ ابھی دیانت داری، ہمدردی اور تعاون کے تذکرے برابر جاری ہیں اور ان کے لئے دین و آخرت کے حوالے بھی دیئے جاتے ہیں جن کا اثر کسی حد تک ہوتا ہے، اور بہت سے افراد کی اس طریقہ سے اصلاح بھی ہوتی ہے، لیکن کوشش کی مقدار زیادہ نہیں ہے، تھوڑی بہت اچھی مثالوں کی وجہ سے نیز دعوت و نصیحت کے کچھ کام کی صورت میں یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ کافی ہے اور معاشرہ اس سے درست ہو جائے گا، لیکن یہ کافی نہ ہونے کے باعث معاشرہ میں کافی خرابیاں پیدا ہو گئیں۔

اگر دکاندار کی ناواقفیت اور کسی دوسرے کی نظر سے بچنے کا موقع مل جائے تو خریدار قیمت سے زیادہ مال حاصل کر لیتا ہے، اور اگر گاہک کی ناسمجھی یا غفلت کا موقع دکاندار کو مل جائے تو وہ اس سے زیادہ دام حاصل کر لیتا ہے، اسی طرح ایک ساتھ رہنے والے ایک دوسرے کی اشیاء کو غفلت کا موقع ملنے پر بقدر اخفاء اپنی ملکیت میں لے لیتے ہیں، اور ایک دوسرے کی اشیاء کو بلا اجازت استعمال کرنے کا رواج تو بہت عام ہے خواہ اس سے اصل مالک کو دشواریاں اور نقصانات کتنے بھی پیش آئیں۔

ہمارے مسلم معاشرہ میں بھی یہ کمزوری بڑھتی جارہی ہے، اس کی بڑی وجہ

یہ ہے کہ ہمارا گھریلو ماحول پھر ہمارا تعلیمی نظام، دلوں کو انسانی ہمدردی کا عادی اور خوفِ خدا اور تصور آخرت سے وابستہ کرنے سے بہت کوتاہ اور غافل ہے، علم تو ڈھیروں مہیا کرنے کی فکر کی جاتی ہے، لیکن سیرت کو درست کرنے اور انسان بنانے کے طریقے بہت کم اختیار کیے جاتے ہیں، اس کے نتیجہ میں وہ اخلاقی کمزوریاں دلوں میں گھر کر لیتی ہیں جن سے معاشرہ پراگندہ اور خودغرض بنتا جاتا ہے، دوسرے کی چیز بلا اجازت استعمال کر لینا، دوسرے کی مخفی باتوں کی ٹوہ میں رہنا، اپنے معمولی فائدہ کے لئے دوسرے کا بڑا نقصان کر دینا، ذاتی منفعت کی طلب میں ملت کو نقصان پہنچانا، دنیاوی فائدہ کی خاطر آخرت کی بربادی مول لے لینا، ہماری معاشرت میں پھیلتا جا رہا ہے۔

ایک ادارہ نے اپنے ٹیلی فون پر طویل فاصلہ کی کالیں مخفی طور پر بار بار ہو جانے کے بعد ایک تختی لگائی کہ یہ قومی مقصد کا ٹیلی فون ہے براہِ کرم کال کریں تو اس کا معاوضہ بھی ادا کریں تختی کی پروا کیے بغیر ایک صاحب کال کرنے لگے جب ان سے کہا گیا تو انہوں نے جواب دیا کہ میں بھی قوم کا ہوں، اور بے تکلف کال کی۔ اور دل چسپی کی بات یہ ہے کہ ایسی باتوں کو دین کے خلاف محسوس نہیں کرتے حالانکہ ان معاملات میں دین کی واضح ہدایات موجود ہیں۔ یہ احساس کہ مالک سے اجازت لے کر ہی اس کی چیز استعمال کی جائے اور اس کی اجازت پر ہی اس کی چیز کو اپنی ملکیت میں لیا جائے خواہ وہ چیز کتنی ہی معمولی ہو، بہت کم لوگوں کو اس کا احساس ہوتا ہے کہ یہ دیانت داری کی کمی کا معاملہ ہے، اور جہاں تک تعاون و ہمدردی کا تعلق ہے تو وہ تو مخلصانہ طور پر اور محض اللہ کے لئے کرنے کے دائرہ سے تقریباً باہر ہو چکا ہے، اب تو جس کے تعاون و ہمدردی کا گہرا جائزہ لیا جائے تو اس کے پیچھے عموماً کوئی دنیاوی مفاد مخفی ملتا ہے، حتی کہ آپس میں ملنے جلنے میں، ایک

دوسرے سے اخلاق کے ساتھ پیش آنے میں، محبت واحترام کے ساتھ پیش آنے میں، دوسرے کی ضرورت وطلب کو خوش دلی سے پورا کرنے میں اکثر دنیاوی مفاد کا مخفی عمل داخل ملتا ہے، اس طریقہ سے ہمارا معاشرہ محض ایک مصنوعی ربط ومحبت کا معاشرہ بن گیا ہے، اس میں اخلاص کے جذبہ سے اور للہ فی اللہ کرنے کا جذبہ بہت قلیل یا مفقود ہو چکا ہے۔

حقیقت میں خوف خدا اور تصور آخرت کے کمزور پڑ جانے کے ہی یہ اثرات ہیں، جب خوفِ خدا اور تصور آخرت ہوتا ہے تو باہمی ربط وضبط اور تعاون و ہمدردی، اخلاص، بے غرضی اور سچے ربط وضبط کی خو اور طاقت پیدا ہوتی ہے، جس سے انسانیت اور سچے اخلاق کی فضا بنتی ہے، اور زندگی میں زندگی کا مزہ آتا ہے، عہد رسالت اور عہد خلفاء راشدین میں خوفِ خدا اور تصورِ آخرت کے بہت سے واقعات ہیں، اس کے بعد کے زمانوں میں بتدریج ان میں کمی ہوتی ہے، لیکن اسلام کا کوئی زمانہ ان جیسے واقعات سے خالی نہیں رہا حتی کہ موجودہ عہد میں بھی اس جذبہ کے حامل واقعات ملتے ہیں، تعاون وہمدردی کے بے لوث واقعات تو وقتاً فوقتاً دیکھنے کو ملتے رہتے ہیں، بڑے تعاون اور وسیع ہمدردیوں کے واقعات سے بھی یہ زمانہ خالی نہیں، مثال کے طور پر مکہ مکرمہ کا ایک واقعہ کہ ایک پاکستانی نوجوان جو مکہ مکرمہ میں کام کرتے ہیں دونوں گردوں کے بے کار ہو جانے سے مرض میں مبتلا ہوئے، ان کو ڈاکٹروں نے بتایا کہ وہ کسی کا گردہ اپنے جسم میں منتقل کریں تب ہی وہ بچ سکتے ہیں، مصارف ایک لاکھ سے زیادہ تھے، ان کے بعض احباب اس کے لئے فکرمند ہوئے، اسی دوران ایک عرب آئے اور دورانِ گفتگو ان کو اس کا علم ہوا، انہوں نے دریافت کیا کہ کیا مسئلہ ہے، معلوم ہونے پر دریافت کیا کہ کیا مصارف ہوں گے، ان کو بتایا گیا کہ فی الحال ایک لاکھ ریال کا

خرچ ہے، انہوں نے اسی وقت رقم نکال کر دے دی، جب ان سے ان کا نام دریافت کیا گیا تو انہوں نے کہا کہ جس کے لئے میں نے کیا ہے یعنی خدائے تعالیٰ میرا نام جانتا ہے اور یہ کہہ کر چلے گئے، کیا یہ بات اللہ کی رضا اور جزائے آخرت کے علاوہ کسی اور سبب سے ہو سکتی ہے؟۔

اور جب خوفِ خدا اور تصور آخرت سے زندگی خالی ہو تو وہ واقعات بکثرت مشاہدہ میں آتے ہیں جن میں بے دردی اور خود غرضی کا مظاہرہ ہوتا ہے تو وہ ملکی قانون سے بھی قابو میں نہیں آتے مثلاً ریلوے یا ہوائی حادثات کے موقع پر ہلاک شدہ اور زخمی لوگوں کے مال پر فوراً قبضہ کرنا اور اس سلسلہ میں سخت دلی اور بے دردی کا مظاہرہ کرنا ایک عام چلن بن گیا ہے، حتیٰ کہ روس جیسے سخت گرفت رکھنے والے ملک میں آرمینیا کے زلزلہ سے متاثرین اور امریکہ میں سونامی اور کٹرینا زلزلوں سے متاثرین کے ساتھ بے دردی کے واقعات کی تصویریں سامنے آئیں جو اس بات کی علامت ہیں کہ قانون اور ضرب وحرب سے ایک مصنوعی اور ناقص روک تو لگ سکتی ہے لیکن حقیقی اور جامع روک نہیں ہو سکتی۔

اکرام مسلم اور احترام انسانیت

ہماری زندگی کے تمام کام دو قسموں میں بٹے ہوئے ہیں، ایک وہ جو ہماری خواہش اور مرضی کے مطابق ہیں، اور دوسرے وہ جو ہماری خواہش اور مرضی کے خلاف ہیں، مثلاً اپنی پسند کا کھانا، اپنی پسند کا پہننا، اپنے کو آرام پہنچانا، اپنی پسند اور خواہش کے کاموں میں وقت صرف کرنا، اپنا رعب جمانا، اپنی بڑائی جتانا اور اپنے کو دلکش اور پسندیدہ دکھانا۔ یہ سب ہماری پسند و خواہش کی باتیں ہیں، ان کے کرنے میں ہم کو کوئی تکلیف نہیں ہوتی، بلکہ جی لگتا ہے اور مزا ملتا ہے، اس پر جو وقت صرف ہو خوشی سے صرف کیا جاتا ہے جو پیسہ خرچ ہو وہ فراخدلی سے کیا جاتا ہے، اس کے لیے کسی کے شوق دلانے کی دوسرے کے رغبت دلانے کی تاکید کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی، یہ سب خود بخود ہوتا ہے اور دنیا میں ہر طرف انجام دیا جا رہا ہے، ان پر خوشی کے ساتھ خوب وقت صرف کیا جاتا ہے اور خوب دولت صرف کی جاتی ہے، لیکن وہ کام جو ہماری خواہش اور مرضی کے خلاف ہیں لیکن اچھے ہیں اور ضرورت و شرافت کے ہیں، سارا مسئلہ

ان کا ہے، ان کے انجام دلانے کے لیے اہل اخلاص و دردمند لوگوں کو کوشش کرنا ہوتی ہے، مسلمان کو اس کا مذہب تلقین کرتا ہے کہ زندگی کی ذمہ داریوں کو خدا کے احکام کے مطابق اور اپنے تعلق اور اردگرد کے لوگوں کے فائدے نقصان کا لحاظ کر کے پورا کیا جائے، اس کو بتایا گیا ہے کہ اس کو آخرت میں اپنے پروردگار کے سامنے حاضر ہو کر جواب دینا ہوگا، کہ اپنے پروردگار کے کہنے کے مطابق زندگی گزاری تھی یا نہیں اور اپنی راحت کی فکر و طلب کرتے وقت دوسرے کے ساتھ زیادتی یا اس کی حق تلفی تو نہیں کی تھی، قرآن مجید میں اور حدیث شریف میں اس کے احکام ہیں، تفصیلات ہیں، تاکیدیں ہیں، اور آخرت کے اجر کی امید دلائی گئی ہے، اور سزاؤں سے ڈرایا گیا ہے، جو مسلمان اللہ سے ڈرتے ہیں، اور آخرت میں بہتری چاہتے ہیں ان کے یہاں اس کے اثرات ملتے ہیں۔

دیگر مذاہب کے ماننے والوں کے یہاں بھی اس کی کچھ ہدایات ملتی ہیں، جن کی روشنی میں آدمی کو یہ خیال ہو سکتا ہے کہ اپنے آرام اور فائدہ کی طلب میں ہم اتنا نہ بڑھ جائیں کہ دوسروں کو نقصان پہنچے، لیکن مذہب سے بے پرواہ لوگوں میں خواہ مسلمان ہوں یا غیر مسلم یا سراسر دنیا سے وابستہ جن کے یہاں مذہبی تعلیمات سے کوئی سروکار نہیں، یا ان کے دین میں من مانی زندگی گزارنے پر کوئی مواخذہ نہیں ان کے یہاں جتنا میسر ہو سکے عیش کیا جائے اور جو ممکن ہو سکے وہ فائدہ اٹھایا جائے ایسے لوگ اپنے آرام کے لیے اور اپنی خواہش پورا کرنے کے لیے جو بھی زیادتی یا حق تلفی کریں کوئی تعجب کی بات نہیں، دوسروں کی تکلیف یا نقصان کا لحاظ کیے بغیر اپنی خواہش و آرام کی فکر کرنا دراصل یہ وہ ذہن ہے جس نے اس وقت دنیا میں تباہی مچا رکھی ہے، ظالم کو ظلم میں مزا آتا ہے یا فائدہ حاصل ہوتا ہے، لہٰذا وہ مظلوم کی تکلیف کی فکر کیوں کرے، عیش پسند کو اپنے عیش کے لیے

دولت صرف کرنا ہے، وہ اس کے حصول کے لیے اچھے برے اور حق ناحق کی فکر کیوں کرے، اور ایسا آدمی جب اپنے مقاصد کے حصول کی فکر کرے گا اور اس کے لیے مال کی ضرورت ہوگی تو وہ مال کسی نہ کسی طرح حاصل کریگا خواہ کسی دوسرے کو نقصان پہنچانا پڑے، رشوت، سود، غبن دوسرے کے ساتھ ظلم یہ سب اسی طرز زندگی سے پیدا ہوتے ہیں، یہ وہ صورت حال ہے جو بڑھ کر ساری دنیا کو تباہی کے غار میں پہنچا سکتی تھی اور کمزوروں اور غریبوں کی زندگیوں کو جہنم بنا سکتی تھی۔

لیکن اللہ تعالیٰ کا بڑا کرم ہے اس نے ہر انسان کے سینہ میں دل رکھا ہے، اس دل میں اس کا ضمیر ہے جو بری بات کو برا دیکھ سکتا ہے اور اس پر ٹوک سکتا اور اچھی بات کو اچھا دیکھ سکتا ہے اور اس کی رغبت دلا سکتا ہے، اس طرح اگر ایک طرف انسان کا نفس اس کو دھوکہ دیتا ہے اور اس کی خواہش کے لیے بری بات کو بھی اچھا بنا کر پیش کرتا ہے، تو دوسری طرف اس کا ضمیر اشارہ کرتا ہے کہ نہیں یہ بری بات ہے، اس طرح نفس اور ضمیر کی کشمکش ہوتی ہے، ضمیر طاقتور ہو تو نفس کو روکتا ہے اور بہت سی برائیاں رک جاتی ہیں اور دنیا کسی طرح چلتی رہتی ہے، دوستی کے حقوق کا لحاظ اور قدردانی نظر آجاتی ہے، پڑوسی کے کچھ حقوق بھی ادا ہوجاتے ہیں اور مظلوم کی دادرسی کا احساس بھی اس کی کچھ مدد کی طرف متوجہ کردیتا ہے اور اس طرح انسان خواہ دکھاوے کے لیے کرے کچھ نہ کچھ کرتا ہے، اگر نفس کو تنہا حکمرانی مل جاتی تو دنیا جلد ہی تباہ ہوجاتی، امیر لوگ غریبوں کی زندگیوں کو دشوار کردیتے، ظالم مظلوم کو ختم کردیتا، دنیا کا کوئی عیب عیب نہ سمجھا جاتا، آدمی صرف اپنے ذاتی مفاد کی فکر کرتا خواہ وہ دوسرے کی نظر میں کیسا ہی برا کام ہو اور خواہ اس سے کسی دوسرے کو کتنا ہی نقصان ہوتا ہو، لیکن ضمیر ہر انسان کے پاس ہے اور وہ زندہ ہو تو ٹوکتا ہے اور بہت سی برائیوں اور زیادتیوں سے روک

دیتا ہے۔ اسی لیے اصلاح چاہنے والے ضمیر کو آواز دیتے ہیں ضمیر کو بیدار کرتے ہیں، ضمیر بری بات کو دیکھ کر کہتا ہے کہ بری بات کو لوگ کیا کہیں گے، دنیا کیا سوچے گی، لوگ کیا رائے قائم کریں گے، یہ بات آدمی کے لیے کچھ روک بن جاتی ہے اور دنیا میں برائی پر جرأت کم ہو جاتی ہے اور بہت سی برائیاں رک جاتی ہیں، لیکن یہ جب ہوتا ہے جب ضمیر زندہ ہو، بیدار ہو۔

لیکن ضمیر مردہ ہو یا کمزور ہو تو مقابلہ نہیں کر پاتا ہے، اس وقت دنیا میں ضمیر عموماً مغلوب ہے، نفس کی حکمرانی ہے، اچھے برے کی تمیز اٹھتی جا رہی ہے، مسلمان کے لیے ضمیر اور اللہ کی ناراضی کا خوف دو رکاوٹیں ہیں اور غیر مسلم میں صرف ضمیر کی رکاوٹ ہے، لیکن بڑے افسوس کی بات ہے کہ مسلمان دو رکاوٹوں کے باوجود برے حال میں ہیں، غیر مسلموں اور دنیاداروں میں وہ کون سی برائیاں ہیں جو مسلمانوں میں نہیں ہیں، حالانکہ وہ خیر امت ہیں، ان کی مذہبی کتاب قرآن مجید ان کے سامنے ہے جس میں جگہ جگہ ان برائیوں کی طرف متوجہ کیا گیا ہے جن میں خدا تعالیٰ کی ناراضی سے ڈرایا گیا ہے اور ان برائیوں کے برے نتائج بتائے گئے ہیں، حدیث شریف موجود ہے جس کی تعلیمات میں انسان کو خوبیوں اور برائیوں سے واقف کرایا گیا ہے، لیکن ان سب باتوں کے اثرات نہ ہونے کے برابر ہیں، ہم اپنے نفع اور مصلحت کے حصول میں دوسرے کے حق کے حدود سے پار ہو جاتے ہیں، اور یہی نہیں بلکہ اپنے عمل کے درست اور صحیح ہونے کے ہر طرح کے دلائل تیار کر لیتے ہیں، اپنا تھوڑا فائدہ ہو رہا ہو تو اس کے نتیجہ میں دوسرے کا زیادہ نقصان بھی نہیں دیکھتے، اپنی پسند کا معاملہ آجائے تو نہ خدا کے حکم پر دھیان دیتے ہیں اور نہ دوسرے کو جو نقصان ہو سکتا ہے، اس کو دیکھتے ہیں جہیز لینے کا موقع مل رہا ہو تو یہ نہیں دیکھتے کہ دینے والے پر کیا گزرے

گی اور کیا تباہی آئے گی، جہیز کی مقدار کو کم محسوس کرتے ہیں تو بیوی کی زندگی دشوار کر دیتے ہیں، دفتر میں ہوتے ہیں اور کام کرانے والے سے سابقہ پڑتا ہے تو اس کی کسمپرسی کی طرف دھیان دیئے بغیر اس سے جو فائدہ اٹھانا ممکن ہوتا ہے اس کے اٹھانے سے دریغ نہیں کرتے، اپنے کھیت کے چھوٹے ہونے کا احساس ہوتا ہے تو پڑوسی کے کھیت سے جتنا ممکن ہو سکے اپنے کھیت میں ملا لینا چاہتے ہیں، بازار میں مال فروخت کرتے ہوتے ہیں تو گراں بیچنے کی کوشش زیادہ کرتے ہیں خواہ اس کی وجہ سے ضرورت مند آدمیوں کو کیسی ہی تکلیف ہو جائے، اپنی طے کردہ رائے کا دفاع اس طرح کرتے ہیں جیسے وہ عقیدہ کی بات ہو کہ ذرا فرق نہیں ہو سکتا اور دوسرے کی رائے اگر اچھی نہ معلوم ہو تو اس طرح اس کو قابلِ نظر انداز قرار دیتے ہیں جیسے وہ مذہبی گمراہی ہو، اپنی عقل میں اپنی سمجھ پر بے انتہا اعتماد اور دوسرے کی سمجھ کو احمقانہ یا طفلانہ سمجھتے ہیں، اپنی رائے پر جم جانا اور دوسرے کی رائے کو نا قابل اعتناء سمجھنا ایک ایسا مرض ہے جو ہمارے مشرق میں اور مسلمانوں میں بڑھا ہوا ہے، اس کی وجہ سے ہر ایک اپنی رائے پر اڑتا ہے اور اس کے مقابلہ میں دوسرے کے قول و فعل کو مکمل نا سمجھی قرار دیتا ہے۔

اسی کا نتیجہ ہے کہ ہمارے مشرق میں کوئی انجمن ہو یا جماعت، کوئی ادارہ ہو یا مسجد اس کے منتظمین متحد نہیں رہ پاتے، اپنی اپنی رائے کو اولیت دیتے ہیں، اس حد تک بڑھ جاتے ہیں کہ بالآخر لڑ کر ایک دوسرے سے علاحدہ ہو جاتے ہیں، پھر ایک دوسرے پر خود رائی اور بے عقلی کا الزام لگاتے ہیں، اور شدت بڑھتی ہے تو غیروں کے سامنے مقدمہ لے جاتے ہیں اور اپنے اپنے عمل کو اللہ کے لیے، قوم کے لیے، دین کے لیے سمجھتے ہیں، اور دوسرے کے عمل کو خود غرضی اور نفس پرستی قرار دیتے ہیں، اس طرح ہمارے تمام ملی کام انتشار کا شکار ہوتے رہتے ہیں اور

برسوں ساتھ کام کرنے والوں کے دل آپس میں بری طرح جدا ہو جاتے ہیں، اگر ہم اپنے عمل اور اپنی رائے میں بھی غلطی اور برائی ہونے کا امکان محسوس کریں اور اس پر خلوص سے غور کر لیا کریں اور دوسرے سے اختلاف رائے کو سلجھانے کا نرم طریقہ اختیار کریں اور اکرام مسلم اور احترام انسانیت کو مدنظر رکھنے کی کوشش کریں تو نہ صرف یہ کہ بہت سے مسائل حل ہو سکتے ہیں، بلکہ ٹوٹے دل دوبارہ جڑ سکتے ہیں اور توافق و محبت بحال ہو سکتی ہے، اور ہمارا معاشرہ باہمی ہمدردی، تعاون و استحکام کے ساتھ چل سکتا ہے اور ایک دوسرے کے عمل و رائے میں جو کمزوری ہو سکتی ہو وہ بھی خوش اسلوبی کے ساتھ دور ہو سکتی ہے، یا کم از کم اس کا ضرر بہت کم ہو سکتا ہے، اسی طرح اپنے عمل و رائے کا نیک دلی کے ساتھ جائزہ لیتے رہنا کہ اس میں کیا خدا کی مرضی کے خلاف ہو سکتا ہے اور کیا دوسروں کے لئے نقصان دہ ہو سکتا ہے اور جو غلط محسوس ہو اس سے بچنے کی کوشش کرنا ہمارے معاشرہ کی خوبی اور بہتری کا بڑا ذریعہ ثابت ہو سکتا ہے۔